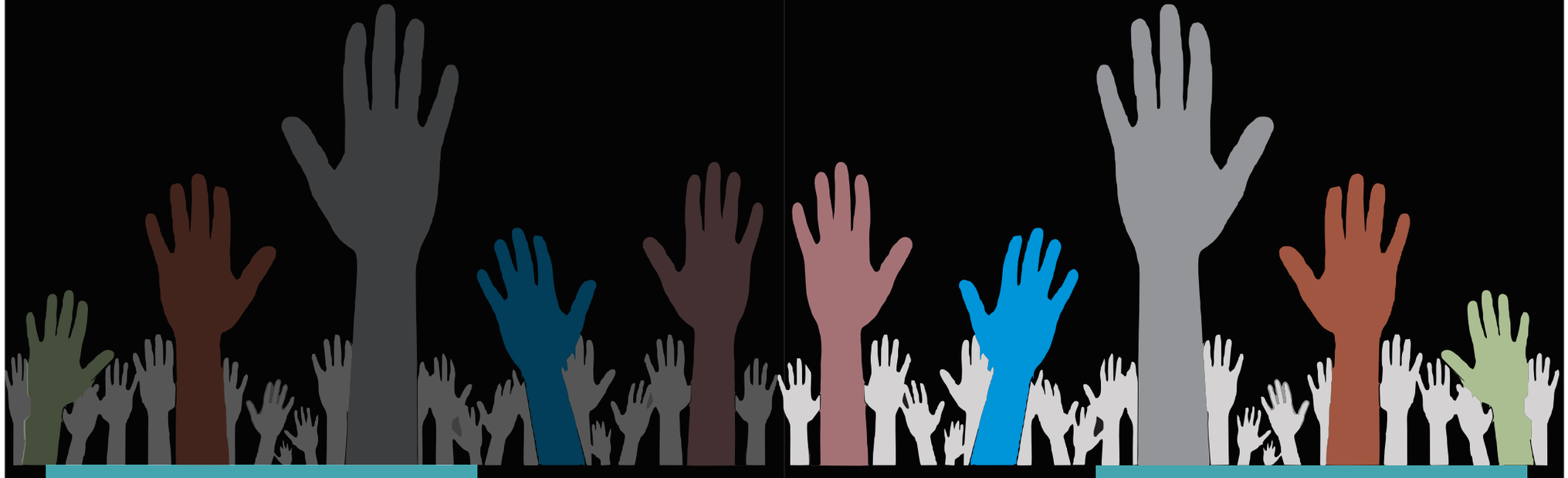

مردانگی اور صنفی انصاف:

مردوں کی انحراف واختیار کی کشمکش

پانچ مردوں کی کہانیاں

روزن، جون 2012

House # 11, St # 15, G-7/2
Islamabad
T: 051- 2890505-6,
F: 2890508

Web: www.rozan.org
E-mail: humqadam@rozan.org
P.O Box 2237, Islamabad

Rozan

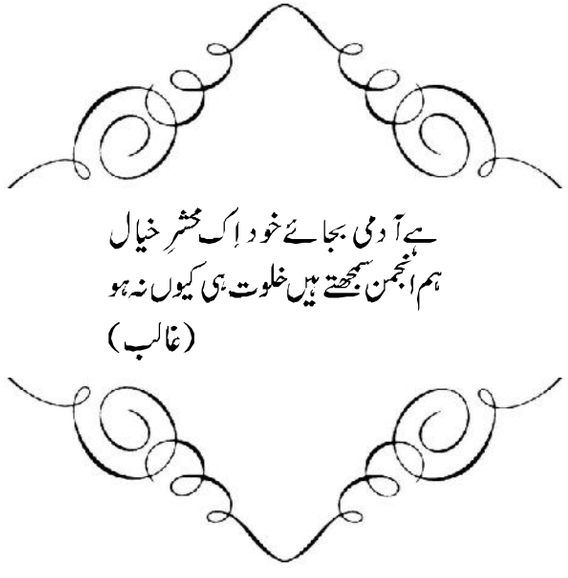

ہے آدمی بجائے خود اِک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
(غالب)

مردانگی اور صنفی انصاف: مردوں کی انحراف واختیار کی کشمکش

عنوانات

اظہارِ تشکر 4
تعارف 6
پیش لفظ 8
تعارف تحقیق 12
تحقیقی خاکہ 18
ایسا بھی تو ہوسکتا ہے۔۔۔کہانیاں 29
تجزیہ 80
باپ اور ماں: شخصیت ساز 80
مرد اور تشدد: مظلوم اور ظالم 84
مردانگی کو ثابت کرنا: ایک مشکل امر 87
مردوں کی کہانیاں اور مثبت اقدامات 90
روایتی مردانگی سے انحراف کرنا اور اپنانا 95
ایک مختلف مرد کی تلاش 100
ضمیمہ جات 105
حوالہ جات 113

اظہارِ تشکّر

زیرِ نظر تحقیق روزن ٹیم کی دوسالہ مشترکہ کوششوں کا ثمر ہے، روزن اس تحقیق کی تکمیل میں حصہ ڈالنے والے تمام ساتھیوں کا فرداً فرداً شکر گزار ہے۔

سب سے پہلے ہم تحقیق میں شمولیت اختیار کرنے والے پانچ حضرات کے تہہِ دِل سے شکر گزار ہیں کہ جن کے وقت، کوشش اور طرزِ فکر و عمل کے بغیر یہ تحقیق ناممکن تھی۔ تحقیقی مقاصد کو پیشِ نظر رکھتے ہُوئے جس طرح ان حضرات نے اپنی زندگی کے دریچے ہمارے سامنے وا کیے، وُہ قابلِ صد تحسین ہیں۔ ہم معاشرتی انصاف کے قیام کی جدوجہد سے اُن کی وابستگی کی دِل سے قدر کرتے ہیں۔

خصوصاً ڈاکٹر شمع دوسہ (ریسرچ سپروائزر) جن کی ماہرانہ راہ نمائی اور تحمل مزاجی کے باعث یہ تحقیق پایہء تکمیل تک پہنچی۔ سب سے بڑھ کر ان کا روزن ٹیم پر بھرپور اعتماد کہ ہم مل کر اِس مشکل ہدف کو حاصل کر سکتے ہیں، قابلِ ستائش ہے۔ ان کی راہ نمائی کے بغیر شاید ہم یہ طریقہء تحقیق نہ اپنا پاتے۔

صفی اللہ خان، کوآرڈینیٹر (ہم قدم پروگرام۔ روزن) نے تحقیق کے دوران معلومات اکٹھی کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ انھوں نے ہر شریکِ تحقیق کے ساتھ متعدد طویل وقت گزارا اور اس عمل میں حقیقتاً ضم رہے۔ وہ کم و بیش 400 صفحات پر مشتمل انٹرویوز حیرت انگیز طور پر اپنی یادداشت میں محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ وہ نہ صرف تحقیق کے عمل میں معاون رہے بلکہ تجزیہ کرنے، شرکاء کی زندگیوں کی کہانیاں ترتیب دینے اور رپورٹ لکھنے میں بھی شامل رہے۔

ماریہ رشید (پروگرام ڈائریکٹر۔ روزن) جنہوں نے تحقیق کی ابتداء میں تحقیقاتی ڈھانچے کی تکمیل اور آخری مراحل میں تجزیہ نگاری اور رپورٹ لکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ماریہ رشید کی شعوری کھوج لگانے کی حس اور منفرد سوچ نے تحقیقاتی تجزیے کو نئی جہتوں سے روشناس کیا۔

محمد رضوان سعید، اسسٹنٹ پروگرام کوآرڈینیٹر (رابطہ پولیس پروگرام۔ روزن) جنہوں نے رپورٹ کا اردو زبان میں ترجمہ کیا، تحقیق سے ان کے لگاؤ اور سیکھنے کے عمل میں دلچسپی نے ٹیم کے باقی ممبران کو بھی مستفید کیا۔ وقت کی کمی اور مشکل اصطلاحات کا اردو ترجمہ بلاشبہ ایک چیلنج تھا جسے انھوں نے نہ صرف انتہائی پراعتماد انداز میں قبول کیا بلکہ اسے مخلصانہ طور پر نبھانے کی سعی بھی کی۔

ہم صالحہ رامے، کوآرڈینیٹر (زیست پروگرام۔ روزن) اور راشد کاظمی پروگرام آفیسر (رابطہ پولیس پروگرام۔ روزن) کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے تجزیہ کرنے کے دوران اپنی قیمتی آراء دیں۔

ہم شبانہ عارف (سینیئر کوآرڈینیٹر پروگرامز۔ روزن) کے انتہائی ممنون ہیں جنہوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود رپورٹ کی تصحیح میں مدد کی، اُن کی وسعت نظری اور اُردو زبان سے لگاؤ نے رپورٹ کی اشاعت کے لیے ترتیب میں معاونت کی۔

انٹرویوز کو لفظ بہ لفظ نوٹ کرنے میں معاونہ ملک اور احتشام احمد کا کردار قابلِ ستائش رہا۔ تحقیق کے مختلف مراحل میں روزن کے باقی ساتھیوں نے بھرپور تعاون کیا جس میں سحر نقوی، صبا سلیم، میمونہ سرور، مہرین لیاقت، رابعہ تبسم، حمیرا کریم، عفت اور عنبرین شریف کے نام شامل ہیں۔ ہم اِن کے شُکر گزار ہیں۔

اس تحقیق کی تکمیل کے لئے مالی وسائل کی فراہمی پر ہم پارٹنرز فار پریونشن (Partners for Prevention- P4P) کے شکر گزار ہیں۔ خاص طور پر اس سارے عمل کے دوران Mr.Raymond Brandes کی تحمل مزاجی اور تعاون کی داد دیتے ہیں۔

تعارف

روزن اسلام آباد میں قائم ایک غیر سرکاری تنظیم ہے، جو سوسائیٹیز ایکٹ 1860 کے تحت 22 دسمبر 1998 کو رجسٹرڈ ہوئی۔13 سال قبل قائم کردہ یہ ادارہ سالہا سال کے ارتقائی مراحل سے گزر کر اب مقامی سطح سے بلند ہو کر قومی سطح کا درجہ اختیار کر چکا ہے جس میں چھ مختلف پروگرامز و معاون یونٹس کام کر رہے ہیں۔ روزن سماجی حقوق کے لئے متحرک گروہوں، افراد اور ریاستی اداروں کے ساتھ مل کر کام کر رہا ہے۔

روزن کا مقصد تمام لوگوں بالخصوص کمزور (vulnerable) گروہوں کے ساتھ باہمی جدوجہد سے باشعور اور تشدد سے پاک معاشرے کی بنیاد رکھنا ہے جو خود اپنے لئے اور دوسروں کے لیے قابلِ قبول ہو۔

اِس وقت روزن کے چار بنیادی پروگرامز ہیں:

آنگن: (بچوں اور نوجوانوں کا پروگرام) آنگن جذباتی صحت بالخصوص بچوں پر جنسی تشدد کے حوالے سے ایک معلوماتی و تربیتی مرکز کے طور پر کام کرتا ہے۔

زیست: (عورتوں کا پروگرام) زیست عورتوں کی جذباتی صحت بالخصوص صنفی عدم مساوات اور عورتوں پر تشدد کے خلاف کام کرتا ہے۔

رابطہ: (پولیس پروگرام) رابطہ عورتوں اور بچوں پر ہونیوالے تشدد کے خلاف پولیس کی استعدادِ کار بڑھانے پر کام کرتا ہے۔

ہم قدم: (مردوں اور لڑکوں کا پروگرام) ہم قدم مردانگی پر تحقیق کے ساتھ ساتھ مردوں اور لڑکوں کو عورتوں پر ہونے والے تشدد کے خلاف آواز اٹھانے کے لئے متحرک کرتا ہے۔

مندرجہ بالا پروگرامز کی مدد کے لئے دو اور یونٹس بھی کام کر رہے ہیں:

روزن ہیلپ لائن: یہ ہیلپ لائن ماہرینِ نفسیات کی ٹیم پر مشتمل ہے جو بچوں، عورتوں، مردوں اور نوجوانوں کو جذباتی و نفسیاتی صحت کے حوالے سے مشاورت فراہم کرتے ہیں۔ مشاورت کے عمومی ذرائع ٹیلیفون، ای میل اور مشاورتی کیمپس ہیں، تاہم بالمشافہ مشاورت کی سہولت بھی مہیا کی جاتی ہے۔

منسلک: (میڈیا و عوامی وکالت) منسلک سماجی مسائل پر رائے عامہ ہموار کرنے میں میڈیا کے ساتھ کام کرتا ہے اور باقی پروگرامز کو اس حوالے سے مدد فراہم کرتا ہے۔

ہم قدم: (صنفی برابری کے لئے لڑکوں اور مردوں کا پروگرام)

روزن کے آغاز سے ہی صنفی عدم مساوات کے خلاف کی جانے والی سرگرمیوں میں مردوں اور لڑکوں کی شمولیت روزن

کا خاصہ رہا ہے۔ وہ 'سفید ربن مہم' جہاں نوجوان رضا کاروں کی شمولیت یقینی بنائی گئی یا پولیس ٹریننگ پروگرام کہ جہاں بڑے پیمانے پر مردوں کی تربیت کی گئی، اِن تمام کوششوں میں مردوں کو صنفی عدم مساوات کے خلاف رفیق کے طور پر دیکھا گیا۔ چند سرگرمیوں میں نوجوان لڑکوں کی ضرر پذیر حالتوں مثلاً جنسی تشدد سے متاثرہ ہونے کی بنیاد پر مدد بھی فراہم کی گئی۔

مثبت سماجی تبدیلی کی راہ پر مردوں اور لڑکوں کے ہم قدم ہونے کی ضرورت روزن کو اپنے کمیونٹی میں کام کے تجربے سے مزید واضح ہُوئی، اسی ضرورت و اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہُوئے دسمبر 2008 میں 'ہم قدم' کے نام سے ایک الگ پروگرام کی بنیاد رکھی گئی، یہ پروگرام معاشرے میں صنفی تشدد کے خاتمے اور صنفی برابری کے حصول کے لئے مردوں اور لڑکوں کی شمولیت کو یقینی و مؤثر بنانے پر کام کرتا ہے۔

پروگرام کی طویل المدّت حکمت عملی تین اجزاء پر مشتمل ہے:

1۔ تحقیق کے ذریعے مردانگی کے معاشرتی تصورات اور پیچیدگیوں سے متعلق علم میں اضافہ کرنا۔

2۔ دوسرے اداروں سے جُڑت اور تربیت کے ذریعے اُن کی استعدادِ کار کو بڑھانا۔

3۔ کمیونٹی کی سطح پر متعلقہ سرگرمیوں کا انعقاد اور اُن کی جانچ کرنا۔

ہم قدم پروگرام کی اب تک کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

1. Understanding Masculinities: A Formative Research on Masculinities and Gender-Based Violence, 2010.

2. Partners for Change: A Mapping Study of Organizations Working with Men and Boys on Gender Equality in Pakistan, 2011.

3. Engaging with Boys and Young Men to Address Gender-based Violence and Masculinities: A Training Module for Boys and Young Men, 2011.

4. Rozan's Work with Men and Boys in Rehmatabad - An Evaluation Study, 2012.

پیش لفظ

جنوبی ایشیاء میں عوامی جگہوں پر مرد بکثرت نظر آتے ہیں۔گلیاں، پارکس، شاپنگ ایریاز، تفریحی مقامات، کام اور عبادت کی جگہیں مردوں سے اٹی ہوئی ہیں جہاں وہ اطمینان اور سکون سے گھومتے ہیں۔مردوں کو زمان ومکان کے حوالے سے پورا اختیار ہے اور اگر کہیں کوئی قدغن نظر آتی ہے تو وہ دیگر مردوں کی طرف سے ہی ہے نہ کہ خواتین کی طرف سے۔ بیک وقت متضاد صورتِ حال نظر آتی ہے؛ مرد آزادانہ طور پر گھومتے ہیں اور عورتوں کو اس حوالے سے پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بجا طور پر صنف ایک ایسے تعلق کو بیان کرتی ہے جو کہ طاقت سے جڑا ہے۔اس سب کے باوجود ماضی قریب تک مردانگی کا تصور صنفی مباحثے سے غائب رہے۔ مرد ہر طرف نظر آتے ہیں لیکن کیا یہ ضروری نہیں کہ دیکھا جائے کہ مرد یہ کیسے سیکھتے ہیں کہ کچھ چیزیں جو ان کا فطری حق ہیں جبکہ وہی چیزیں عورتوں کے لئے ممنوع سمجھتے ہیں (اس کے ساتھ ساتھ ایسے مردوں کو بھی دیکھنا جو روایتی مردانگی کے ماڈل پر پورا نہیں اترتے)۔اس عمل کے دوران بہت سارے ایسے عوامل نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں جو مردوں کو طاقتور بناتے ہیں۔روزن کی تحقیق پالیسی بنانے والوں، درسگاہوں سے تعلق رکھنے والوں اور انسانی حقوق کے لئے متحرک افراد (Activists) کی مشترکہ کاوش کا حصّہ ہے تاکہ وہ طاقت پر مبنی تعلقات جن کو صنف سے جوڑا جاتا ہے، کو سامنے لایا جاسکے۔اگرچہ اس تحقیق کا فوکس پاکستان ہے مگر اس کی اہمیت عالمی سطح کی ہے۔ طاقت کے صنفی پہلو کو سمجھنا اور اس سے نمٹنے کا طریقہ کار وغیرہ وہ باتیں ہیں جو کسی خاص جغرافیائی اور سیاسی حدود تک مقید نہیں۔

عمومی طور پر مردوں کو تشدد کرنے والے تصور کیا جاتا ہے مگر اس عمومی تصور کے باوجود تشدد کو مردوں کی فطرت نہیں کہا جا سکتا۔وہ رویے جنہیں ہم 'مردانہ' رویے کہتے ہیں اگر وہ حیاتیاتی ہوتے تو (1) ہمیں تمام مردوں میں یکساں نظر آتے (2) اور ان میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہ ہوتی۔ کیونکہ حیاتیاتی خصوصیات تبدیل نہیں ہوتیں۔ یہ سمجھنا کہ مردوں کا یہ رویہ حیاتیاتی نہیں بلکہ معاشرتی ہے ہماری توجہ اس طرف دلائے گا کہ مرد خاص طرح سے کیوں برتاؤ کرتے ہیں اور ان کے جارحانہ اور غیر مناسب برتاؤ میں کس طرح تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ یہ بات اس طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ معاشرتی ماحول کی وجہ سے مرد مختلف رویے اپناتے ہیں۔اگر ہمیں ایسے طریقوں کی نشاندہی کرنی ہے جن کی بدولت مردوں کو غیر جارح اور نہ حاوی ہونے والا بنایا جاسکتا ہے تو ہمیں ان حالات پر توجہ دینی ہوگی جو کہ مردوں کو اس طرح کے رویوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ایسی کیا صورت حال ہوتی ہے جب مرد روایتی مردانہ تصورات سے انحراف کرتا ہے اور منصفانہ خیال رکھنے والا اور بہادرانہ ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ یہ اس تحقیق کا بنیادی نقطہ ہے۔روزن ان ثقافتی اور سماجی حالات کو سمجھنا چاہتا ہے جو مردوں کو خاص طرح کا مرد بناتے ہیں۔اس طرح روزن صنفی انصاف کی فراہمی کے عمل میں اپنا حصّہ ڈال رہا ہے۔ یہ ایک انتہائی اہم پراجیکٹ ہے جسے پریکٹیشنرز کو اپنانا چاہیے نہ کہ صرف ان تعلیمی اداروں یا محققوں کو جو مردانگی کے حوالے سے تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔اس تحقیق میں اس بات کا ادراک موجود ہے کہ تھیوری اور پریکٹس میں تقسیم کرنا ایک لایعنی بات ہے۔ سماجی ناانصافی کے خاتمے کے لئے کیے جانے والے اقدامات کا تحقیق سے گہرا ربط ہونا چاہیے جو

کہ ہمیں ناانصافیوں کی نوعیت کے بارے میں آگاہ کرتی ہے۔
یہ تحقیق روزن کی 2010 میں راولپنڈی میں کی گئی تحقیق کا فالواپ ہے۔اس تحقیق میں لائف ہسٹری طریقہ کار استعمال کیا گیا ہے جو کہ انفرادی زندگیوں کے مطالعے سے معاشرتی ساخت کو سمجھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ طریقہ صنف سے جڑے ہوئے دو اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے:
اول پہلو کو روزلنڈ۔او۔ہنلون کا درج ذیل اقتباس جامع طور پر بیان کرتا ہے؛
'طاقت کے شجرے کی مکمل سمجھ جہاں عورتیں اپنی زندگی گزارتی ہیں'، بقول ہنلون ''تقاضا کرتا ہے کہ ہم مردوں کو بھی صنفی طور پر دیکھیں۔ان کے مرد ہونے کا احساس کن سماجی اور نفسیاتی بنیادوں پر ہوتا ہے، ملتی جلتی صنفی شناخت کی بنیاد پر کون سے نیٹ ورکس اور مماثلتیں مردوں کو باہمی قریب کرتی ہیں اور کون سی درجہ بندیاں انہیں جُدا جُدا کرتی ہیں'' (او۔ ہنلون 1997)۔

دوم: اس حقیقت کو مانتے ہوئے کہ طاقت کی درجہ بندی میں مرد سب سے اُوپر ہیں، روزن نے یہ کوشش کی ہے کہ ایسے مردوں کی زندگیوں کو دیکھا جائے جنہوں نے دُنیا کے مردانہ اور پدرسری خیالات کو چیلنج کیا۔ ایسے مردوں میں کیا خصوصیات پائی جاتی ہیں؟ اور کیا وہ کسی متبادل قسم کی مردانگی کا نمونہ فراہم کرتے ہیں؟ جس طرح سے اس تحقیق نے اِن سوالات کو اُٹھایا ہے، وہ بہت اہم بات ہے۔ اِس تحقیق کی خاص بات یہ بھی ہے کہ اِس نے طریقہ کار اور تجزیہ پر خصوصی توجہ دی۔شاملِ تحقیق مردوں کے ساتھ وقت گزارنا اور ان کی روزمرہ زندگی کا وسیع موضوعات اور سماجی عوامل (مثلاً رُتبہ، نسل اور مذہب) کے ساتھ ربط دیکھنا۔ تاہم وسیع البنیاد تجرباتی مواد کی موجودگی میں یہ تحقیق فقط واقعات کے بیان سے آگے بڑھتے ہوئے صنفی شناخت اور طاقت کی فطرت کے بارے میں تھیوری کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔

سب سے بڑھ کر یہ تحقیق بتاتی ہے کہ مردوں کو سادہ اقسام میں تقسیم کر کے نہ سوچا جائے جیسا کہ بہت ساری تحقیقات اس طرف راغب کرتی ہیں۔ اس تحقیق میں بلاشبہ روزن کا مقصد نئے راستوں کی تلاش ہے۔ اس تحقیق میں پاکستان کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے پانچ مردوں نے حصہ لیا۔ ان مردوں نے مردانہ جارحیت کی مختلف صورتوں کے خلاف مثبت اقدام کیا۔ یہ تحقیق مردانہ شناخت سے جڑی ہوئی غیر مستحکم اور پیچیدہ صورتِ حال کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ تحقیق اِس آسان نتیجے سے گُریز کرتی ہے کہ شاملِ تحقیق مرد، بہت ''اچھے مرد'' تھے اور ان کی اچھائی کو صفائی اوزاروں کی مدد سے ماپا جاسکتا ہے۔صنفی انصاف کے بہت سارے پروگرامز میں یہ رجحان غالب رہا ہے کہ مردوں کے رویے اور برتاؤ میں تبدیلی لائی جائے جہاں یہ تحقیق ایسے مردوں کی توصیف کرتی ہے جنہوں نے مردانہ جارحیت کے خلاف مثبت اقدامات کیے وہاں یہ سوال بھی اُٹھتا ہے کہ کیا مثبت اقدام کرنے والے مردوں نے اپنے آپ کو بدل لیا یا ان کے اقدامات درحقیقت ان کے روایتی مردانہ رویوں کے ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ درج ذیل پیراگراف ''اچھی'' مردانگی کے حوالے سے ایک اہم بیان ہے:
''اس تحقیق میں ہمیں پتا چلتا ہے کہ جنسی زیادتی سے متاثرہ مردوں اور عورتوں کی مدد کے لئے مثبت اقدامات کرنے

والے مرد اپنے روایتی مردانہ فریم ورک میں رہ سکتے ہیں جہاں ان سے توقعات ہوتی ہیں کہ وہ کمانے والے، محافظ، جنگجو، معاشرہ کو سماجی برائیوں سے پاک کرنے والے اور معاشرتی اقدام کے رکھوالے ہیں۔ ''طاقت پر مبنی تعلقات'' کو چیلنج کیے بغیر وہ یہ سب اقدامات کرتے ہیں۔ تین لائف ہسٹریز اس دلیل کو تقویت بخشتی ہیں۔ ان تین مردوں کے لئے اختیار کی ''جائز'' حیثیت ہونا انتہائی اہم ہے چاہے یہ اختیار نسل، سرکاری عہدہ یا خاندان کے معاشرتی رُتبے کی وجہ سے ہو۔''

یہاں ایک اور نقطہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ ضروری نہیں مردوں کی تقسیم صرف ''اچھے'' اور ''برے'' کی صورت میں ہی ہو۔ ایسے مرد جنہوں نے خواتین کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں پر آواز اُٹھائی، ہوسکتا ہے ان مردوں کی ہمدردیاں ہم جنس پرست مردوں کے لئے نہ ہوں۔ یہاں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مردانگی کوئی ایک قسم نہیں ہے بلکہ مردانہ شناخت کی درجہ بندی پیدا کرنے میں جنس، رُتبہ، نسل اور مذہب اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مرد خود بھی مردانگی کی ڈیمانڈ کی وجہ سے مشکل کا شکار ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ مرد مردانگی کے معیار کے مطابق رہنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ لیکن مردوں کے حوالے سے یہ انتہائی کم دیکھنے میں آیا کہ وہ اپنے آپ کو "متاثرہ" سمجھتے ہوں۔ بلاشبہ درج بالا معلومات اس تحقیق کا خاصہ ہیں۔

روزن کا مقصد تبدیلی کے عوامل کو جاننا اور مردوں کی شمولیت کے حوالے سے کام کرنا ہے نہ کہ آئیڈیل مرد کی شناخت ڈھونڈنا بلکہ یہ تحقیق مردانہ شناخت کی غیر مستحکم فطرت اور ''طاقت پر مبنی تعلقات'' کی پیچیدہ صورت کے بارے میں بتاتی ہے۔ عموماً یہ تصور کیا جاتا ہے کہ مشاہدہ کرنے والا با آسانی شناخت کرسکتا ہے کہ فلاں عمل کیوں کیا گیا مگر یہ تحقیق تحریکات کے شفاف ہونے کے اس نظریے کو مزید پیچیدہ بناتی ہے۔ NGOs میں کام کرنے والوں کے لئے اس طرح سماجی زندگیوں کو دیکھنے کے طریقہ کی اہمیت کو کم نہیں کیا جاسکتا ہے۔ NGO سیکٹر میں کئی منصوبے صرف اس وجہ سے کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکے کہ انسانی سماجی رویوں کے بارے میں سادہ مفروضات وضع کئے گئے مثال کے طور پر یہ سمجھنا کہ مرد اس لئے اپنے رویے میں تبدیلی لاتے ہیں کہ وہ مروجہ حاوی ہونے والی مردانگی کے خلاف ہیں، اور ایسے مفروضات کو نام نہاد سائنسی طریقہ کار کی مدد سے ٹھیک ثابت کرنے کی جستجو کی گئی۔ بدقسمتی سے یہ سب کوششیں فنڈز دینے والے اداروں کو مخصوص دورانیہ میں نتائج دینے کے لئے کی گئیں۔ اس سے بھی تباہ کن صورتِ حال یہ ہے کہ رویوں میں تبدیلی کو ماپنے کے لئے بنائے گئے اوزار صرف انسانیت کے ایک رُخ کے بارے میں بتاتے ہیں چہ جائیکہ سماجی رشتوں اور اقدامات کو سمجھنے میں مدد دیں۔ روزن کی اس تحقیق کا یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ وہ سوچنے کے اس طریقہ کار کو چیلنج کرتی ہے اور دلیرانہ طور پر اس بات کا اظہار کرتی ہے کہ ہر معاشرہ اور طاقت کی فطرت کے بارے میں سادہ مفروضات قائم کر کے سماجی تبدیلی لانا ممکن نہیں۔ اس کے برعکس تبدیلی کے خواہاں لوگوں کو ایماندارانہ طور پر ان پیچیدہ رکاوٹوں کی نشاندہی کرنی چاہیے جو کہ سماجی تبدیلی سے متعلقہ ہیں اور اس بات کا احساس بھی ہونا چاہیے کہ کوئی ایسی جادوئی چھڑی نہیں ہے

جس کی مدد سے پلک جھپکتے ہی یہ سب راز عیاں ہوجائیں۔ مردانہ شناخت کی بُنت کا یہ ایک باریک تجزیہ ہے جو کہ ایک انتہائی صبر آزما کام ہے۔

منجے سری واستو
پروفیسر آف سوشیالوجی
انسٹیٹیوٹ آف اکنامک گروتھ
دہلی یونیورسٹی نارتھ کیمپس
دہلی

تعارفِ تحقیق

دنیا میں حقوق کے حصول کے لئے چلائی گئی بڑی تحریکوں اور نسائی تحریکوں نے صنفی تشدد کے حوالے سے اپنی تحقیقات اور عوامی وکالت کی کوششوں کو خواتین کے حقوق یا اس بارے میں ریاست کی پوزیشن تک محدود رکھا۔ ان تحریکوں کا بنیادی عنصر خواتین کو بااختیار بنانا تھا تاکہ وہ خود ریاست کو خواتین کے حوالے سے ذمہ دار ٹھہرا سکیں اور ریاست سے اس باب میں کی جانے والی قانون سازی اور مہیا کی جانے والی خدمات کے بارے میں سوال کر سکیں۔ اس سارے سلسلے میں مرد اور مردانگی پر فوکس نہیں کیا گیا۔ اب یہ احساس شدید ہوتا جا رہا ہے کہ صنفی تشدد سے نمٹنے کے لئے ضروری ہے کہ مرد اور مردانگی کے نظریہ کو سمجھا جائے۔ یہ سلسلہ 1975ء سے شروع ہوتا نظر آتا ہے۔ 'پارٹنرشپ'، 'مل کر کام کرنا'، 'شامل کرنا' اور 'ساتھی' جیسے الفاظ صنف کے حوالے سے کی جانے والی پروگرامنگ اور 'عوامی وکالت' کے کاموں میں مستعمل ہیں۔ فعالیت (Activism) کی بحث میں بھی درج بالا الفاظ کا ذکر نمایاں ہے۔ صنف کے شعبے میں عملیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے اور اس حوالے سے مردانگی کے مطالعہ کے لئے مردوں کے تجربات اور ان کے صنف کے ساتھ تعلق کو منظم اور ساختی امتیاز کو واضح کرنے والے عوامل کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔

قبل ازیں مردوں کی ظاہری اور معاشرتی طور پر ان کو دی گئی خصوصیات سائنسی، مذہبی اور شہریت کے اعتبار سے زیر بحث نہیں آئیں۔ تاہم اب مردانگی کی مختلف اقسام کو الگ الگ شناخت کیا جاتا ہے۔ ان اقسام کا ماخذ، ہیئت اور اس کے مختلف پہلو زیر مطالعہ ہیں۔ مردانگی کو سمجھنے کی یہ کوششیں گزشتہ بیس برسوں سے جاری ہیں اور ان کی بدولت آج اس موضوع پر وسیع تحقیقی مواد موجود ہے۔ جینڈر سٹڈیز اور جنسیات کے شعبوں میں اس بات کا احساس موجود ہے کہ پدر شاہی اور صنفی تعلقات کی بُنت کو سمجھنے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ مردانگی کے نظریہ کو دوبارہ دیکھا جائے اور مردانگی کو اس کے سیاق وسباق میں سمجھا جائے۔ ہم صنفی تشدد کو سمجھنے کے حوالے سے مردوں اور مردانگی پر مزید تحقیق پر زور دیتے ہیں اور ہمارے نزدیک اس کی درج ذیل بنیادی وجوہات ہیں:

اول: صنفی تعلقات کو تبدیل کرنا، ان کو برابری کی بنیاد پر استوار کرنا اور ان پر پدر شاہی کے اثرات کو کم کرنے کے لئے ''صنفی برابری'' کا طریقہ ایک دیرپا عمل ہے اِس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ موجودہ صنفی درجہ بندی کو ختم کرنے کے لئے مردوں (جو کہ صنف کی درجہ بندی میں بہتر مقام پر ہیں) کو شامل کیا جائے تاکہ یہ تبدیلی ممکن ہو سکے۔ اگرچہ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مردوں کو صنفی برابری کے حوالے سے ''استعمال'' کیا جا رہا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ مردوں کی شمولیت کے بغیر صنفی تبدیلی کا عمل کم مؤثر رہے گا بلکہ خواتین پر تبدیلی کی ذمہ داری ڈالنے کی وجہ سے خواتین پر بوجھ مزید بڑھے گا۔

دوم: یہ جاننا بھی اہم ہے کہ مرد بھی صنفی سٹیریوٹائپنگ کے اثرات سے متاثر ہوتے ہیں اور بحیثیتِ فرد انہیں صنفی

غیر برابری، ناانصافی اور سٹیریوٹائپس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس بات کا ادراک نہایت ضروری ہے کہ کس طرح غیر مساوی صنفی روایات مردوں اور عورتوں کی معاشرتی نشوونما کے عمل کا حصہ ہوتی ہیں۔ یہ روایات غیر لچکدار صنفی سٹیریو ٹائپنگ کا سبب بنتی ہیں جو کہ مردوں اور لڑکوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف فوائد مثلاً اختیار، گھومنے پھرنے اور طاقت وغیرہ مردوں کے لئے مخصوص طرح کے دباؤ اور ضرر پذیری کا سبب بنتے ہیں۔ یہ ضرر پذیری بصورت 'بچپن میں جنسی تشدد' ہو سکتی ہے (آنگن، روزن 2007، ص15) اور پرخطر رویہ کی صورت میں بھی ظاہر ہو سکتی ہے مثلاً غیر محفوظ طریقے سے جنسی تعلقات قائم کرنا اور جنسی مسائل کے حوالے سے راہ نمائی اور مدد وغیرہ نہ لینا (بارکر 2008)۔ لڑکے اور بچے دیگر مردوں کی ''مردانہ سرگرمیوں'' کی وجہ سے زیادتی کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دیگر مردوں کے اُکسانے پر ایسے پرتشدد اقدامات کا نشانہ بننا (ہمقدم 2012)۔ کئی چھوٹے لڑکے پرتشدد رویہ اپنانے کو ضروری اور لازمی خیال کرتے ہیں (ریلی اور ساتھی 2004)۔

سوم: شواہد سے پتا چلتا ہے کہ نوآبادیاتی نظام نے بہت سارے ملکوں میں معاشی حالات، معاشرتی اور گھریلو ڈھانچے کو متاثر کیا ہے اور اس نظام کے اثرات نے دنیا کے بہت سارے حصوں میں ''مردانگی کا کرائسز'' پیدا کیا ہے جس کی وجہ سے سٹیریوٹائپ کرداروں اور 'طاقت پر مبنی صنفی تعلقات' میں تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔ مثال کے طور پر لڑکیوں کی، لڑکوں کی نسبت سکولوں و کالجوں میں بہتر کارکردگی یا معاشی تبدیلی کی وجہ سے مرد کا کردار بحیثیت ''کمانے والا'' میں تبدیلی اور زیادہ تعداد میں خواتین کا روزگار سے جڑنا۔

چہارم: گزشتہ دو دہائیوں میں ہونے والی سماجی تحقیق نے اس خیال کو تقویت بخشی ہے کہ مردانگی سماجی طور پر بنتی ہے اور اس کی بھی کوئی ایک قسم یا صورت نہیں ہے۔ ہمیں اندازہ ہے کہ بہت سارے مرد ''حاوی ہونے والی مردانگی'' (Hegemonic Masculinity) کے سانچے پر پورا نہیں اترتے اور وہ اختیار، جارحیت، صرف جنس مخالف سے جنسی تعلقات رکھنا اور کنٹرول جیسی خصوصیات کے حامل نہیں ہوتے جبکہ یہ خصوصیات ''حاوی ہونے والی مردانگی'' کا خاصہ سمجھی جاتی ہیں۔ تاہم اس کوشش میں ہیں کہ مردانگی سے جڑے مزید نظریات کو سمجھا جائے جو کہ میڈیا، کلچر اور ریاست کی دین ہیں، اور ان نظریات کے تحت مرد اور مردانگی کو ایک یا اختیار گروہ تصور کیا جاتا ہے۔ 'حاوی ہونے والی مردانگی' کے بارے میں بات کرتے ہوئے کونل کہتی ہے کہ یہ مردانگی کی وہ قسم ہے جو مردوں کے لئے سب سے قابلِ عزت تصور کی جاتی ہے۔ یہ ایک معیار طے کرتی ہے اور دیگر تمام مردوں کو اپنی مردانگی کا تعین اس کے مطابق کرنا ہوتا ہے اور یہ عالمی سطح پر مردوں کی عورتوں پر فوقیت کو ''جائز'' قرار دیتی ہے (کونل 2005)۔ شماریاتی طور پر دیکھا جائے تو یہ عام نہیں لگتا چونکہ صرف قلیل تعداد میں مرد اس پر پورا اترتے ہیں مگر یہ ایک معیار اور روایت بن جاتی ہے۔ "طاقت پر مبنی تعلقات" کے مزید مطالعے نے مردانگی کے حوالے سے نئی اصطلاحات کو جنم دیا ہے۔ مثال کے طور پر ''حاوی ہونے والی مردانگی'' اور ''مشارکتی مردانہ پن'' (Complicit Masculinity) وغیرہ۔ یہ اصطلاحات خاص سیاق و

سیاق میں طاقت کے پیچیدہ استعمال اور پدرشاہی کے مابین ادارہ جاتی اور ساختی تعلقات کو بہتر طور پر بیان کرتی ہیں۔ اس تحقیق نے ہمیں روایتی صنفی درجہ بندی کے نظریہ سے بالاتر ہوکر چیزوں کو دیکھنے کا موقع فراہم کیا ہے۔

مردانگی کوئی جامد چیز نہیں ہے بلکہ یہ تبدیل ہونے والی اور مختلف اقسام کا مجموعہ ہے۔ اس بات کا ادراک ہو جانے کے بعد ہم نے یہ ماننا شروع کر دیا ہے کہ مردوں میں بہت تنوع پایا جاتا ہے۔ یہ احساس غالباً برصغیر میں کافی پہلے سے موجود تھا۔ یہاں پر معاشرتی سطح پر چلائی جانے والی صنفی تحریکوں میں مرد شامل ہوتے تھے، اگرچہ کم تعداد میں ہی سہی۔ راجہ رام موہن رائے نے ستی کے خلاف آواز اُٹھائی (کمار 1993، ص9) ایشور چندرا نے ہندوؤں میں بیوہ کی دوسری شادی کے حوالے سے قانون سازی کے لئے اہم کوششیں کیں اور سر سید احمد نے عورتوں کی تعلیم کے حق میں آواز اٹھائی۔ یہ سب مثالیں اس بات کی عکاسی کرتی ہیں کہ کس طرح برصغیر میں عورتوں کے حقوق کے لئے مردوں نے آواز اُٹھائی تاہم بہت سے ناقدین اس بات کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ عورتوں کے لئے چلائی گئی مہمات کا مقصد عورتوں کی بہتری تھا یا اس میں بھی مرد اپنی طاقت کے دائرہ کار پر مباحث کر رہے تھے (چوپڑا 2007، ص7)۔ جب ہم اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ کچھ مرد معاون و مددگار بھی ہوتے ہیں تو بھی ہم اس بات پر غور نہیں کرتے کہ ایسے کون سے حالات تھے جو انہیں مختلف طرح کی مردانگی پر عمل کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں اور یہ مرد روایتی 'حاوی ہونے والی مردانگی' سے علیحدگی اختیار کرتے ہیں۔ یہ بات واضح طور پر نظر آتی ہے کہ اس طرح کے حالات "صنف اور ترقی" اور "مردوں کی شمولیت" جیسے پروجیکٹس کے آغاز سے قبل ہی موجود تھے۔ اس کی وجہ مردوں کا کسی ایسی عورت (جس نے ظلم سہا ہو) کے ساتھ قریبی رشتہ ہونا یا "امن، معاشی انصاف، ماحولیاتی مسائل" سے متعلقہ فعالیت سے جڑنا ہو سکتا ہے، یا اپنے جنسی تشدد کا نشانہ بننے کے تجربات سے نمٹنے کی کوشش (سٹون برگ 1999، ص12)۔ اس طرح کی منحرف پریکٹسس مختلف اشکال اختیار کرتی ہیں جیسا کہ 'نامردانہ' سلسلہء روزگار کو اپنانا اور مردوں کا جنسی تشدد کے خلاف آواز اٹھانا وغیرہ۔ مؤخرالذکر ہماری تحقیق کا موضوع بھی ہے۔

پاکستان کی صورتِ حال:

اقوامِ متحدہ کی انسانی ترقیاتی انڈکس کے مطابق بنائی گئی 2011 کی رپورٹ کے مطابق پاکستان 189 ممالک کی فہرست میں 145 ویں نمبر پر ہے۔ اس ترقیاتی انڈکس میں کسی بھی ملک میں موجود لوگوں کے لئے صحت، تعلیم اور آمدن سے متعلقہ وسائل و مواقع کو دیکھا جاتا ہے۔ اسی طرز پر اقوامِ متحدہ کی طرف سے بنائے گئے صنفی غیر برابری انڈکس میں صنف کے حوالے سے تین پہلوؤں کو دیکھا جاتا ہے: بااختیار ہونا (سیاسی و تعلیمی شعبوں میں شمولیت)، صحت (زچہ بچہ کی شرحِ اموات اور فرٹلٹی ریٹ) اور لیبر مارکٹ میں حصہ داری کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس انڈکس کے مطابق پاکستان 193 میں سے 115 ویں نمبر پر ہے۔ ثانوی تعلیم کے حوالے سے پاکستان میں عورتوں کی شرح 23 فیصد ہے جبکہ مردوں میں یہ شرح 46 فیصد ہے۔ پاکستان کا شمار جنوبی ایشیاء کے ان ممالک میں ہوتا ہے جن میں زچہ کی شرحِ اموات بہت زیادہ ہے (260 اموات فی 100,000 زندہ پیدائشیں)۔

درج ذیل اعداد و شمار اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ پاکستان میں خواتین پر تشدد کی شرح انتہائی زیادہ ہے:

☆ 2011 میں کل 8539 خواتین تشدد کا شکار ہوئیں اور ملک میں مجموعی طور پر خواتین پر تشدد کے کیسز کے اندراج میں 6.74% اضافہ ہوا۔ سال 2011 میں اغوا کے 2089 واقعات ہوئے جس کی شرح 24 فیصد بنتی ہے۔ قتل 1575 (18%)، ریپ / گینگ ریپ 827 (10%)، خودکشی 758 (9%) اور غیرت کے نام پر قتل کے 705 (8%) کیسز سامنے آئے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ تعداد صرف رپورٹ کئے گئے کیسز کی ہے جبکہ حقیقت میں ایسے کیسز کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔

☆ سال 2007 میں آغا خان یونیورسٹی کے شعبہء کمیونٹی ہیلتھ کی طرف سے کی گئی ایک تحقیق میں شامل زیادہ تر (80%) خواتین کو اپنے شوہروں کی طرف سے مار پیٹ کا سامنا رہا اور 57.5% نے بتایا کہ انہیں دیگر سسرالیوں کی طرف سے تشدد کا سامنا رہا۔

پاکستان کے تناظر میں مردانگی کے حوالے سے بہت کم تحقیقات ہوئی ہیں۔ ماسوائے چند ایک شائع شدہ تحقیقات کے تمام تر تحقیقات تھیسز کے مسودوں کی صورت میں ہیں۔ موضوع کے حوالے سے موجودہ مواد کے مطالعے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ان تحقیقات کا زیادہ تر زور "غریب کمزور خواتین" اور "برے مرد" جیسی اختراعی تفریق پیدا کرنے پر رہا۔ بہت سارے کیسز میں تو ابھی تک صنف کو بمعنی عورت استعمال کیا جاتا ہے۔ مردانگی کے حوالے سے سارا کام صرف جنسیات کے کام سے متعلقہ ہے اور وہ سارا کام بھی صرف ایچ آئی۔وی۔ایڈز کے پھیلاؤ اور جنسی صحت کے پیرائے میں ہے۔

زیرِ نظر تحقیق

اس تحقیق سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ جنسی تشدد کے خلاف اقدام کرنا مروجہ تصورِ مردانگی اور پدرسری نظام سے انحراف کرنا ہے یا اس نظام سے علیحدگی کو ظاہر کرتا ہے۔ صنفی بنیادوں پر تشدد پدرسری نظام کی زیادتیوں کا کھلا اظہار ہے اور یہ اظہار سماجی رتبہ، نسل، کلچر اور قومیت کی سطح پر نظر آتا ہے اور زمانہِ قدیم سے موجود ہے۔ پدرشاہانہ نظریات عورتوں کو دبانے اور کنٹرول کرنے کے لئے تشدد بشمول تشدد کی دھمکی کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں (روزن ہمقدم 2010)۔ اس تشدد کا دائرہ کار دیگر کمزور طبقات تک پھیل جاتا ہے مثال کے طور پر وہ مرد جو معاشرتی سطح پر مردوں سے جڑی توقعات (مثلاً کمانا اور جسمانی طاقت) پر پورا نہیں اترتے۔ اس گروہ میں وہ لڑکے بھی شامل ہیں جو کہ جنسی تشدد کا شکار ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے ایک انتہائی کمزور اور ضرر پذیر گروہ ہیجڑوں اور ہم جنس پرست مردوں کا ہے۔

تشدد بہت ساری صورتوں میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً گھریلو تشدد، زنا بالجبر، انسسٹ، جنسی زیادتی، جنسی طور پر ہراساں کرنا، فحش تصاویر دکھانا وغیرہ۔ بالعموم عورتوں، بچوں اور ہیجڑوں پر تشدد کرنے والے مرد ہوتے ہیں۔ اس کی ایک جزوی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پدرسری نظام جو کہ دنیا کے بیشتر معاشروں میں موجود ہے مردوں کے پُرتشدد رویے کی نہ صرف

حمایت کرتا ہے بلکہ اس کے فروغ کا باعث بھی بنتا ہے(UNESCAP, 2007)۔

مرد اس تشدد میں بحیثیت تشدد کرنے والے شامل ہیں یا بعض اوقات وہ خاموش تماشائی کے طور پر اس کا حصّہ بنتے ہیں جو کہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ان خاموش تماشائیوں کے نزدیک مردوں کی طرف سے تشدد ایک عام اور جائز بات ہے۔اس بات کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ عورتیں تشدد نہیں کرتیں یا وہ خاموش تماشائی نہیں بنتیں۔وہ بھی ایسا کرتی ہیں اور اسکی متفرق وجوہات ہوسکتی ہیں۔یہاں پر فوکس ان مردوں پر کیا جارہا ہے جو تشدد کے خلاف کچھ کر سکتے ہیں مگر نہیں کرتے۔

اس رویے کی ایک ممکنہ وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس طرح خاموش رہنے والے مرد ایسی مردانگی کا اظہار کرتے ہیں جو کہ حاوی ہونے والی تو نہیں مگر وہ خاموشی سے بھی اِس حاوی ہونے والی مردانگی کی حمایت کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک 'حاوی ہونے والی مردانگی' کی معاشرہ میں موجودگی کے باعث مردوں کو بحیثیت مجموعی برتری حاصل رہتی ہے۔لہذا وہ خود تشدد تو نہیں کرتے اور نہ ہی 'حاوی ہونے والی مردانگی' کے حامل ہوتے ہیں مگر وہ 'مردانگی' سے حاصل ہونے والے فوائد سے ضرور فیض یاب ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ ایک ممکنہ وجہ خوف بھی ہوسکتا ہے۔خاموش رہنے والے مردوں کو لگتا ہے کہ اگر وہ اس تشدد کے خلاف آواز اٹھائیں گے تو انہیں 'بڑے مردانہ گروپ' سے علیحدگی یا تمسخر کا نشانہ بننے کی صورت میں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔تو یہاں یہ سوال ابھرتا ہے کہ کچھ مرد 'پدر رشاہی طاقت کے اظہار' کو کچھ صورتوں میں چیلنج کیوں کرتے ہیں(فلڈ 2005،ص 464)۔یہ تحقیق ایسے ہی مردوں کی زندگیوں کا احاطہ کرتی ہے جو مثبت اقدامات کرتے ہیں اور اس توقع کو بھی چیلنج کرتے ہیں کہ وہ ایسے جنسی جارحیت کے اقدامات کی مخالفت نہیں کریں گے اور خاموش رہیں گے۔

اس تحقیق کی بنیاد روزن کی 2010 میں کی گئی تحقیق ہے۔پہلی تحقیق سے حاصل شدہ معلومات اور مردوں کے ساتھ کام کرنے کے تجربے کی روشنی میں درج ذیل سوالات سامنے آئے:

ا۔ کچھ مرد جنسی تشدد کے خاتمے کے لئے مثبت اقدامات کرتے ہیں جبکہ دوسرے مرد ایسا نہیں کرتے۔ کیوں؟

ب۔ ان مردوں کو کون سے عوامل ایسے اقدامات پر ابھارتے ہیں؟

ج۔ ان مردوں میں کیا مختلف ہے؟

د۔ جو مرد ایسے مثبت اقدامات کرتے ہیں وہ ایسے اقدامات کے نتائج کا سامنا کس طرح کرتے ہیں؟

ر۔ جو مرد ایسے اقدامات کرتے ہیں کیا وہ سٹیریوٹائپ کرداروں کو چیلنج کرتے ہیں؟ کیا وہ متبادل مردانگی کا اظہار کرتے ہیں؟

ان سوالات نے تحقیق کا مقصد وضع کرنے میں مدد کی جو کہ درج ذیل ہے:

عورتوں، مردوں، بچوں اور ہیجڑوں پر ہونے والے جنسی تشدد کے خلاف مردوں کے کئے گئے مثبت اقدامات سے متعلقہ تجربات کو کھوجنا

درج بالا سوالات تحقیق کی بنیاد ثابت ہوئے۔ہمارا وژن ہے کہ روزن اور ہماری طرح کے دیگر ادارے جو کہ مردوں کے ساتھ کام کرتے ہیں اس تحقیق کی مدد سے مرد اور مردانگی کے تصورات کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے، اور اس کی وجہ سے کمیونٹیز کے اندر ہمارے کاموں میں بہتری لائی جاسکتی ہے۔یہ تحقیق مردانگی سے متعلقہ بحث کو سمجھنے کی ابتدائی کوشش ہے اور اس موضوع کو مزید گہرائی میں سمجھنے کے لئے اور زیادہ کام کرنے کی انتہائی ضرورت ہے۔

زیرِ نظر کتاب انگریزی سے ترجمہ کی گئی ہے۔تاہم بعض مقامات پر انگریزی متن کی تلخیص پر اکتفا کیا گیا ہے۔اس کتاب کے دوسرے باب میں تحقیق کے لئے چُنے گئے طریقہ کار کے بارے میں بتایا گیا ہے۔اس کے بعد شاملِ تحقیق مردوں کی کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔یہ کہانیاں صیغہ واحد متکلم میں لکھی گئی ہیں۔تاہم شرکاء کے بیان کردہ الفاظ کو بعینہٖ لکھنے کی وجہ سے بعض جگہوں پر کہانیوں کا ربط اور روانی متاثر ہوئی ہے۔یہ کہانیاں متعلقہ شرکاء کو بھی دکھائی گئی ہیں اور انہوں نے ان کے حوالے سے اطمینان کا اظہار کیا ہے۔کہانیوں کے بعد تجزیہ اور اختتامیہ والے ابواب ہیں۔آخر میں ضمیمہ جات ہیں جو کہ ان کاغذات (غیر رسمی انٹرویو گائیڈ، فارم برائے اظہار رضامندی وغیرہ) پر مشتمل ہیں جو کہ دوران تحقیق مختلف حوالوں سے استعمال ہوئے۔

تحقیقی خاکہ

تعارف

کسی بھی تحقیق کے لئے منصوبہ سازی کرتے ہوئے یہ سمجھنا نہایت اہم ہوتا ہے کہ کسی خاص حکمت عملی یا تحقیقی خاکے کے چناؤ کا انحصار بنیادی طور پر تحقیقی سوال پر ہوتا ہے۔ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے اپنی تحقیق کے دوران 'صفاتی تحقیق' (qualitative) کے طریقہ کو اپنایا کیونکہ زیر تحقیق سوال کے جواب کے حصول کے لئے یہ ایک موزوں اور مناسب طریقہ ہے۔ اس طریقہ کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ یہ ہمیں لوگوں کے رویوں، برتاؤ، معاشرتی اقدار، ضروریات زندگی، تحریکات، ثقافت اور رہن سہن کے طریقوں کے بارے میں جاننے اور عمیق مطالعہ کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اس طریقہ ہائے تحقیق کا ماخذ سوشل سائنسز اور انسانیات کے بنیادی شعبے ہیں جن میں بشریات، عمرانیات، فلسفہ، تاریخ اور علم التعلیم وغیرہ شامل ہیں، اور اب یہ طریقہ تحقیق مختلف شعبہ ہائے کار میں مستعمل ہے۔

زیر نظر تحقیق دراصل پاکستان میں مردانگی کے نظریے کو سمجھنے کی ایک جستجو ہے۔ اس کا فوکس ایسے مرد ہیں جنہوں نے کبھی اپنی زندگی میں جنسی تشدد کے خلاف کوئی مثبت اقدام کیا ہو۔ اس تحقیق کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کا بنیادی مقصد صرف مثبت اقدامات کی نشاندہی تک محدود نہیں بلکہ ایسے اقدامات کے پس منظر کا تجزیہ کرتے ہوئے ان محرکات کو سامنے لانا ہے جو کہ مثبت اقدامات کا موجب بنتے ہیں۔ لہٰذا تحقیقی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے لئے ایک خاص طریقہ، لائف ہسٹری کا انتخاب کیا گیا۔

لائف ہسٹری

لائف ہسٹری طریقہ کا ماخذ 'صفاتی تحقیق' کی مختلف صورتیں ہیں جیسا کہ سوانح عمری، خودنوشت، کیس سٹڈی، بیانیہ، نژاد نگاری وغیرہ ہیں۔ یہ طریقہ صفاتی حکمت عملی کا حصہ ہے جس میں اس بات کا پوری طرح احساس ہوتا ہے کہ ذاتی، سماجی، مادی اور سیاق و سباق سے متعلقہ اثرات کسی بھی زیر تحقیق واقعہ/زندگی کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں (کول اور نولز، 2001)۔

یہ بہرحال reductionist کے کسی ایسے نظریے کو تقویت دینے کے لئے نہیں ہے جس میں کسی تجربے یا مشاہدے کی بنیاد پر خاص قسم کے معنی اور حقیقت کو خاص پیرائے میں بیان کیا جاتا ہو۔ یہ انسانی تجربات کا بیان ہے جو کہ پڑھنے والوں کو متوجہ کرتا ہے کہ وہ اس متن کو پڑھیں اور اپنے تجربات کی روشنی میں اس سے نتائج اخذ کریں (کول اور نولز، ص: 10-11)۔ اس تحقیقی طریقہ کا یہ وہ بنیادی مقصد ہے جو ہمارے تحقیقاتی مقاصد سے جڑتا ہے۔ کول اور نولز (2001) کے مطابق ''دوسرے انسانوں کے تجربات کو جانتے اور سمجھتے ہوئے کسی انسان کی حالت کے بارے میں عمیق معلومات لینا۔۔۔ یہ سب زندگی اور سیاق وسباق، ذات اور مقام کے درمیان گنجلک تعلقات اور رشتے کو سمجھنا ہے'' (ص: 11)۔

سامپلنگ

عموماً ایک روایتی لائف ہسٹری طریقہ کار میں چند ایک شرکاء ہی ہوتے ہیں جن سے محقق تفصیلی معلومات حاصل کرتا ہے۔ ہماری تحقیق کے لئے پانچ لوگوں کو شامل کیا گیا ہے۔ ان کا انتخاب پہلے سے طے شدہ معیارات کے مطابق پرکھتے ہوئے کیا گیا۔ شرکاء کی پرکھ کے لئے درج ذیل نکات کو مدنظر رکھا گیا:

ا۔ کسی عورت، مرد، بچے یا بچڑے پر ہونے والے جنسی تشدد کے خلاف مثبت اقدام کیا ہو (چاہے وہ کامیابی سے ہمکنار ہوا ہو یا نہ)

ب۔ جواب دہندہ اپنے آپ کو مرد تصور کرتا ہو

د۔ کم از کم عمر اٹھارہ برس ہو

ر۔ تحقیق کا حصہ بننے پر رضامند ہو

س۔ تحقیق کے لیے ممکنہ درکار وقت دے سکتا ہو

انتخاب کا طریقہ کار

دورانِ تحقیق شرکاء کے انتخاب کے لئے بالواسطہ طریقہ اختیار کیا گیا تا کہ شرکاء کی رضامندی کو یقینی بنایا جا سکے۔ بالواسطہ انتخاب کے طریقے سے مراد یہ ہے کہ تحقیق سے متعلق معلومات ممکنہ/مجوزہ شرکاء تک پہنچائی جاتی ہیں اور پھر یہ ان شرکاء کی صوابدید پر ہوتا ہے آیا کہ وہ اس تحقیق کا حصہ بننے کے مضمرات سے آگاہی رکھتے ہوئے اس میں شمولیت اختیار کرنا چاہیں گے یا نہیں۔

انتخاب کا یہ سلسلہ خاصا مشکل ہے اس کے لئے اضافی وقت بھی درکار ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ممکنہ/مجوزہ شرکاء تک معلومات پہنچانا بھی ایک مشکل امر ہوتا ہے۔ اس تحقیق کے حوالے سے ایک معلوماتی خط بہت ساری غیر سرکاری تنظیموں کو بذریعہ ڈاک اور ای۔میل بھیجا گیا۔ دریں اثنا لوگوں کے رابطے کے لئے ایک فون اور ای۔میل بھی مخصوص کیا گیا۔ معلوماتی خط انگریزی زبان میں لکھا گیا تاہم اس کے ساتھ اردو میں تحقیق کے بارے میں بنیادی معلومات دی گئیں۔ اس خط کے مندرجات میں ابتدائیہ روزن کے تعارف پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ تحقیق کے مقاصد اور انتخاب کا طریقہ کار اور اس میں شامل مختلف مراحل کے بارے میں بھی بتایا گیا۔ خط میں تحقیق سے متعلقہ اخلاقی پہلوؤں کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ شریک تحقیق بننے والوں سے ممکنہ درکار وقت اور تعاون کے بارے میں بھی لکھا گیا (دیکھئے ضمیمہ الف۔ معلوماتی خط، ضمیمہ الف۔A۔ تشدد کا خاتمہ)۔

اداروں اور مختلف لوگوں کے ساتھ ابتدائی رابطے سے پتا چلا کہ مجوزہ شرکاء نے جن کیسز کے حوالے سے مثبت اقدامات کئے وہ صرف گھریلو تشدد سے متعلق تھے۔ نتیجتاً ہم نے اپنے خط کو مزید واضح بنانے کا سوچا تا کہ شرکاء صراحت سے سمجھ سکیں کہ ہم کس طرح کے لوگوں کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں۔ پس ہم نے معلوماتی خط میں وضاحت سے مثبت اقدام کے بارے میں بتایا اور اس سے متعلقہ سرگرمیوں کا تذکرہ بھی کیا۔

یہ خط پاکستان میں کم وبیش 260 اداروں اور افراد کو بھیجا گیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ انتخابی عمل کے لئے ہم نے اپنے غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) اور کمیونٹی کی بنیاد پر قائم تنظیموں (CBOs) کے نیٹ ورکس پر زیادہ انحصار کیا۔ مہیا کردہ وسائل اور میسر وقت کو دیکھتے ہوئے یہ حکمت عملی اپنائی گئی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ سوچ تھی کہ ان اداروں اور افراد کے ذریعے ممکنہ شرکاء کو ڈھونڈنے میں آسانی رہے گی کیونکہ عموماً یہ لوگ/ادارے ایسے افراد کے متعلق جانتے ہیں۔ تاہم اس طریقہ انتخاب نے ہمارے نمونہ تحقیق کو ان اداروں اور ان سے بالواسطہ یا بلاواسطہ جڑے ہوئے افراد تک محدود کر دیا۔

ان خطوط کے ردعمل میں آنے والی فون کالز کے جواب کے لئے راہ نما اصول بنائے گئے اور اس عمل کے دوران ان کی پیروی بھی کی گئی۔ آٹھ افراد (مردوں) نے تحقیقاتی ٹیم سے خود رابطہ کیا اور اس تحقیق کا حصہ بننے کی خواہش ظاہر کی۔ انتیس اداروں نے بذریعہ ای میل، موبائل اور فون پر تحقیقاتی ٹیم سے رابطہ کیا۔ جیسے ہی ہمارے پاس خواہش مند شرکاء کی ایک ابتدائی فہرست تیار ہوگئی تو ہم نے جانچنے کے معیارات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان لوگوں سے ابتدائی انٹرویوز کیے تاکہ ہم اس فہرست میں سے تحقیقی ضرورت اور اس کے لئے مقرر کردہ معیارات پر پورا اُترنے والے شرکاء کی نشاندہی کر سکیں۔ ان انٹرویوز کی بنیاد پر باقاعدہ خلاصہ جاتی فارم پر کیے گئے تاکہ تمام شرکاء کا باہمی موازنہ کیا جا سکے۔ اس طریقہ ہائے کار کو بروئے کار لاتے ہوئے جو افراد مطلوبہ معیارات کے مطابق تھے انہیں منتخب کیا گیا۔ سکریننگ انٹرویوز بذریعہ فون کیے گئے اور ہر انٹرویو اوسطاً 35 منٹ پر مشتمل تھا (دیکھئے ضمیمہ ب۔ سکریننگ گائیڈ لائنز اور ضمیمہ ب A۔ کیس سمری شیٹ)

مجموعی طور پر اکیس افراد کو چنا گیا بشمول پانچ افراد کے جو کہ حتمی طور پر اس تحقیق کا حصہ بنے۔ تین ایسے تھے جو وقت نہ دے پائے۔ دو افراد وہ تھے جنہوں نے بعد میں انکار کر دیا۔ مؤخر الذکر افراد میں سے ایک فرد ذاتی زندگی سے متعلقہ ماضی کے واقعات شیئر کرنے میں تذبذب کا شکار تھا جبکہ دوسرے فرد نے کہا کہ اس تحقیق کا حصہ بننے سے اس کی ملازمت پر اثرات پڑ سکتے ہیں۔ اکیس میں سے باقی افراد انتخاب کے طے شدہ معیارات پر پورا نہیں اترے؛ آٹھ افراد نے گھریلو تشدد کے حوالے سے مثبت اقدامات کیے تھے جبکہ تین افراد کے مثبت اقدامات دیگر منتخب کردہ افراد کے اقدامات سے نسبتاً کم درجہ کے تھے اگرچہ یہ اقدامات اپنی جگہ بہت اہم تھے۔

منتخب کردہ شرکاء کا چناؤ تھیوریٹیکل سامپلنگ کی بنیاد پر کیا گیا جیسا کہ عموماً صفاتی تحقیقات میں کیا جاتا ہے۔ بالخصوص لائف ہسٹری انکوائری میں شماریاتی احتمالی سامپلنگ (Numerical Probability Sampling) لازم نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں ہماری دلچسپی کثرتِ معلومات تھی۔

منتخب کردہ شرکاء کی پروفائلز

تحقیق کے شرکاء کا تعلق خیبر پختونخوا، گلگت بلتستان، پنجاب، سندھ اور دارالحکومت کے علاقوں سے ہے۔ ان شرکاء نے مندرجہ ذیل کیسز کے حوالے سے مثبت اقدامات کیے:

- ☆ ایک رضا کار جس نے اپنے علاقے میں ہونے والے جنسی تشدد کا نشانہ بننے والی عورت کی مدد کی۔
- ☆ ایک فرد جس نے نوجوان لڑکے (جس نے اس واقعہ کے بعد اپنے آپ کو ختم کر لیا تھا) کے ساتھ ہونے والی جنسی زیادتی کے خلاف آواز اٹھائی۔
- ☆ انسانی حقوق کے لئے متحرک فرد جس نے جنسی تشدد کا نشانہ بننے والے لڑکے کی مدد کی۔
- ☆ ایک شوہر جس نے اپنی جنسی تشدد سے متاثرہ بیوی کی مدد کی۔
- ☆ ایک قبائلی فرد جس نے جنوبی پنجاب کے ایسے خاندان کی مدد کی جن کی لڑکی کو اغواء کیا گیا تھا اور اسے جنسی زیادتی کا نشانہ بھی بنایا گیا تھا۔

جب کسی شریک کی نشاندہی ہوتی تھی تو اسے تحقیقاتی طریقہ کار کے بارے میں تفصیلی خط اور اس کے ساتھ 'فارم برائے اظہار رضامندی' بھیجا جاتا تھا (ضمیمہ - ج - فارم برائے اظہار رضامندی)۔ شرکاء کو تحقیق سے متعلقہ تمام اخلاقی پہلوؤں کے بارے میں بھی آگاہی دی گئی۔ انتخاب کا عمل ایک طرح سے مسلسل جاری رہا چونکہ تمام شرکاء کا انتخاب ایک ہی دفعہ میں نہیں ہوا۔

تمام شرکاء اپنی عُمر کی تقریباً 30 سے 40 کی دہائی میں تھے ماسوائے ایک شریک کے جس کی عمر 60 برس سے زائد تھی۔ اگرچہ خواندگی کو انتخاب کا معیار نہیں رکھا گیا تھا تاہم جتنے بھی افراد نے تحقیقاتی ٹیم سے رابطہ کیا وہ پڑھے لکھے تھے اور کم از کم گریجویشن ڈگری کے حامل تھے۔ تمام شرکاء میں ایک قدر مشترک یہ بھی تھی کہ وہ شادی شدہ تھے۔

اخلاقی پہلو

اگرچہ ادارہ جاتی سطح پر اس تحقیق کے لئے رسمی ضابطہ اخلاق بنانے کی ضرورت پر زور نہیں تھا مگر تحقیقاتی ٹیم نے اہم جانا کہ ایسا ضابطہ اخلاق ہونے کی صورت میں تمام اخلاقی پہلوؤں کا بہتر طور پر خیال رکھا جا سکتا ہے۔ یہ اس لئے بھی فائدہ مند تھا کہ پاکستان میں تا حال ایسا کوئی مربوط نظام یا ادارہ موجود نہیں جو NGO سیکٹر میں ہونے والی صفاتی تحقیقات سے متعلقہ ریسرچ پروپوزلز پر نظر ثانی کر سکے۔ علاوہ ازیں محقق اور شرکاء تحقیق کے درمیان پائے جانے والے ''طاقت کے تعلقات'' کو بھی دیکھا گیا کہ کس طرح دونوں کے مابین ایک حساس اور باہمی احترام والا تعلق پیدا کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ کسی بھی شخص کے لئے زندگی کے انتہائی ذاتی واقعات شیئر کرنا مشکل ہوتا ہے۔ باہمی فرق کو کم کرنے کی غرض سے شرکاء کو موقع فراہم کیا کہ وہ بھی محققوں کی ذاتی زندگیوں کے بارے میں سوالات کر سکیں اور جان سکیں۔

احتیاطی تدبیر کے طور پر ریسرچ پروپوزل ایک بیرونی محقق کو بھی دکھایا گیا تا کہ تمام اخلاقی پہلوؤں کا احاطہ کیا جا سکے۔
''فارم برائے اظہار رضامندی'' میں واضح طور پر درج کیا گیا کہ شرکاء سے متعلقہ معلومات کو صیغہ راز میں رکھا جائے گا تا کہ کسی بھی قسم کی ممکنہ مشکلات سے بچا جا سکے جو کہ ان معلومات کے ظاہر کر دینے کی صورت میں ہو سکتی ہیں۔ مزید براں شرکاء کو اس تحقیق کا حصہ بننے کی صورت میں ہونے والے ممکنہ فوائد اور نقصانات سے واضح طور پر آگاہ کر دیا گیا۔ انہیں یہ بھی بتا دیا گیا کہ اس تحقیق کے دوران ان کا کردار کیا ہوگا اور ان سے حاصل کردہ معلومات کا استعمال کیا ہوگا، اور دوران تحقیق شرکاء سے کس قدر وقت درکار ہوگا۔ جب کوئی شریک ان تمام باتوں پر رضامند ہو جاتا تو اسے باقاعدہ طور پر 'فارم برائے اظہار رضامندی' دیا جاتا تا کہ وہ تحریری طور پر ان باتوں کی توثیق کر دے۔ یہ فارم ریکارڈ کے لئے محفوظ کر لیے گئے۔

'صفاتی تحقیق' کی نوعیت کے باعث دوران تحقیق بھی بار ہا شرکاء سے اجازت لی گئی اگر چہ وہ پہلے ہی اپنی رضامندی کا تحریری اظہار کر چکے تھے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ محقق اور شریک کے مابین تعلق بن جانے کے باوجود دونوں (بالخصوص شریک تحقیق) کو یہ احساس رہے کہ جو کچھ بتایا جا رہا ہے وہ تحقیقی مقاصد کے لئے استعمال ہوگا۔

طریقہ ہائے کار (Methods)

لائف ہسٹری کے لئے علم البشریات کے فیلڈ ورک سے متعلقہ اوزار مثلاً انٹرویو، محقق کا ذاتی مشاہدہ (participant observation) وغیرہ کے ذریعے ڈیٹا اکٹھا کیا جاتا ہے۔ اس تحقیق کے لئے بنیادی طور پر تفصیلی غیر رسمی انٹرویوز (In-depth Conversational Interviews) کیے گئے۔ فیلڈ نوٹس لینے کا عمل بھی ساتھ ساتھ جاری رہا۔ سوالات کو ہر شریک کا محقق کے ساتھ تعلق اور شریک کے موڈ کے مطابق ڈھالا گیا۔

اگر چہ تفصیلی غیر رسمی انٹرویوز کرنا ایک چیلنج رہا مگر یہ بہت کارآمد ثابت ہوئے کیونکہ اس میں شریک تحقیق (participant) کو بھی گفتگو کو بڑھانے اور اپنی مرضی کے مطابق چلانے کا موقع ملتا تھا۔ اس وجہ سے شرکاء کے بارے میں کافی مفید معلومات بھی حاصل ہوئیں۔ تحقیقی عمل کی غیر رسمی نوعیت نے شرکاء اور محقق کو مواقع فراہم کیے کہ وہ وقتاً فوقتاً واقعات کو دہرا سکیں اور ضرورت کے مطابق کسی بھی موضوع یا واقعہ کے بارے میں گفتگو کر سکیں۔ اس سے باہمی پر اعتماد تعلق قائم کرنے میں خاصی آسانی رہی۔ شرکاء کی دستیابی کو مدنظر رکھتے ہوئے تحقیقاتی ٹیم کے ممبران نے ایک ایک ہفتہ ہر شریک کے ساتھ گزارا۔ جس کے دوران ان کے ساتھ موافقت پیدا کرنے سے لے کر ان کی روزمرّہ زندگی میں ان کے ساتھ رہنا، ان سے (غیر رسمی) انٹرویوز کرنا جیسی سرگرمیاں شامل رہیں۔

ایک ثانوی اوزار تحقیق کے طور پر ''محقق کا ذاتی مشاہدہ'' شریک تحقیق کے بارے میں بہت ساری معلومات حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ ثابت ہوا۔ مثال کے طور پر (شریک کی اجازت اور توسط سے) اس کے دوستوں سے ملنا اور اس کی روزمرہ کی ذاتی اور پیشہ ورانہ سرگرمیوں کا حصہ بننا ایک ایسا عمل تھا جس نے محقق کو شریک تحقیق سے متعلقہ بہت ساری باتوں کو جاننے اور سمجھنے میں مدد دی۔ (دیکھئے ضمیمہ - د، تفصیلی غیر رسمی انٹرویو گائیڈ)۔

اس تحقیق کے دوران موافقت پیدا کرنے کے حوالے سے ایک مشکل یہ بھی درپیش تھی کہ کس طرح شرکاء سے ملنے کے مقصد اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان سے قائم ہونے والے ذاتی تعلقات میں فرق کیا جا سکے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ باہمی تفاعل کے مقصد اور نوعیت کی یاددہانی ضروری رہی جیسا کہ محقق اور شریکِ تحقیق کے درمیان ایک واضح حد کھینچنا ایک پیچیدہ اور دشوار عمل ہے۔ اس تحقیق کا خاصہ یہ بھی ہے کہ جس میں ایک ایسا اعتماد بھی قائم کیا گیا جس کے ذریعے نفسِ مضمون کے اندر پے در پے چھپے حقائق کو دریافت کرنے کی بھی ایک سائنسی کوشش کی اور اس کے ساتھ ساتھ عکاسیت (Reflexitivity) کے ذریعے ذاتی تعصب کو کم سے کم کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ اس تحقیق میں سوالنامے کے بجائے غیر رسمی انٹرویو کو اپنایا گیا۔ غیر رسمی انٹرویو کو لکھنے میں مشکل پیش آئی چونکہ غیر رسمی گفتگو خود رو اور کسی خاص ترتیب کے بغیر ہوتی ہے۔ اس لئے ہمیں شرکاء کی آراء اور گفتگو کی تنظیم و ترتیب میں کافی دقت پیش آئی۔ بیانیہ طریقہ یہ تقاضا کرتا ہے کہ متن میں سے ایک مربوط لائف ہسٹری نکالی جائے۔

ڈیٹا مینجمنٹ

ٹرانسکرپشن کا طریقہ کار:

جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا ہے کہ تمام انٹرویوز کو الیکٹرونک طور پر بھی ریکارڈ کیا گیا اور پھر اس ڈیٹا کو دو کمپیوٹرز میں محفوظ کیا گیا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر ڈیٹا کو سی۔ ڈیز پر بھی ریکارڈ کیا گیا تا کہ مستقبل میں کمپیوٹر سے ڈیٹا ضائع ہونے کی صورت میں نقصان نہ ہو۔ الیکٹرونک طور پر ڈیٹا ریکارڈ کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ انٹرویوز کی آواز کا معیار خاصا بہتر رہا جس کی وجہ سے تحقیقاتی ٹیم کو انٹرویو ڈیٹا کو کاغذ پر منتقل کرنے اور تجزیہ کرنے میں کافی آسانی رہی۔

تمام ڈیٹا کو لفظ بلفظ رومن اردو میں لکھا گیا اور ایم۔ ایس ورڈ میں ٹائپ کیا گیا۔ ٹرانسکرپشن کرنے میں ٹیم کے دو ممبران کا زیادہ کردار رہا اور ان میں سے ایک ممبر وہ تھا جو براہ راست انٹرویوز کرنے والوں میں بھی شامل تھا۔ ٹرانسکرپشن کو معیاری اصولوں کے مطابق کرنے کے لئے ٹیم کی ایک مختصر ٹریننگ بھی ہوئی۔ تمام ٹیم ممبران نے بار بار آنے والے الفاظ کو وسکس کیا اور ان کو لکھنے کا ایک معیاری طریقہ طے کیا۔ شرکاء کی رازداری کو یقینی بنانے کے لئے ناموں اور ایسے الفاظ جن کی وجہ سے شرکاء کی شناخت ہو سکتی ہو، کو متبادل ناموں/الفاظ سے تبدیل کر دیا گیا۔ اصل ناموں کی فہرست مع متبادل ناموں کے لکھ کر محفوظ کر لی گئی اور اس تک رسائی تحقیقاتی ٹیم کے صرف متعلقہ ممبران کو حاصل تھی۔

تجزیہ اور بیان کا طریقہ

لائف ہسٹری کا تجزیہ ''محض حکایت، فرد یا ذات سے بالاتر ہوتا ہے اور اس میں حکایت اور تشریح کو وسیع تناظر میں دیکھا جاتا ہے۔ زندگیاں سیاق وسباق کے زیر اثر گزرتی ہیں جیسا کہ ثقافت، خاندان، سیاسی وابستگی، تعلیم اور مذہب۔۔۔'' (کول اور نولز، 2001؛ص: 20)۔ پس سیاق وسباق کسی بھی معاملے کی تشریح کے حوالے سے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے مراد ایسا رہن سہن ہے جس میں مادی، جغرافیائی، تاریخی، ثقافتی اور جمالیاتی احساس جیسے عوامل شامل ہوتے ہیں۔ کوئی بھی عمل اس رہن سہن میں وقوع پذیر ہوتا ہے تو اسے سیاق وسباق کے تناظر میں ہی دیکھا جاتا ہے۔ اس بحث کا بنیادی مقصد یہ سمجھنا ہے کہ کس طرح ماضی حال اور مستقبل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مزید براں لائف ہسٹری تجزیہ میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ عموم کو خصوص کے تجزیہ سے سمجھا جاتا ہے (کول اور نولز 2001؛ص: 13)۔ ڈیٹا کی موضوعاتی اعتبار سے تشریح کی جاتی ہے اور اسے متعلقہ شعبہ سے وابستہ نظریات کے تناظر میں ہی دیکھا جاتا ہے۔ اس میں شرکاء کی زندگیوں کی تحقیق کے مطابق تشریح ہوتی ہے اور محقق ان سب چیزوں کو وسیع تناظر میں شریک کی باقی زندگی کے حالات سے جوڑتے ہوئے بھی دیکھتا ہے۔ تجزیہ کے حوالے سے ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ محقق کے ذاتی تجربات، حالات زندگی اور ثقافتی اقدار کے اثر سے کلی طور پر ماورا نہیں ہوتا۔

تجزیے کے عمل کے دوران بار ہا مرتبہ فیلڈ نوٹس اور مطالعاتی مواد کو کھنگالنا پڑا اور تھیوریٹکل بنیاد کو مضبوط کرنے کے لئے مزید مطالعہ بھی کرنا پڑا۔ آخر کار لائف ہسٹریز کو کہانیوں کی صورت میں لکھا گیا کیونکہ کہانیوں کی صورت میں زیادہ بہتر انداز میں معلومات بیان کی جا سکتی ہیں۔

تجزیاتی فریم

ہمارے تحقیقی سوال نے ہی تجزیاتی فریم منتخب کرنے میں مدد دی۔ دو درجوں پر تجزیہ کیا گیا؛ پہلے درجہ پر حاصل کئے گئے ڈیٹا کو بار بار پڑھا گیا اور اس میں شرکاء کی زندگیوں کے اہم واقعات کی نشاندہی کی گئی۔ اسی طرح شرکاء کے کچھ ایسے جملے/الفاظ جو کہ محقق کو بہت دلچسپ اور معنی خیز لگے ان کی نشاندہی کر لی گئی۔ محققوں نے انٹرویوز کے دوران ہونے والے نئے اور اکات کے نوٹس بھی لیے تا کہ دیکھا جا سکے کہ کہاں اور کیسے شرکاء کی کہانیاں محققوں کی ذاتی زندگیوں اور تجربات سے مشابہت رکھتی ہیں۔

دوسرے درجہ کے تجزیہ کے دوران شرکاء کی زندگی کے اہم واقعات کو دوراتی (Chronological) ترتیب کے مطابق لکھا گیا اور ان کے باہمی تعلق اور زندگی کے دیگر پہلوؤں پر اثر انداز ہونے کا تجزیہ کیا گیا۔ ہم نے ان تحریکوں اور دباؤ کا جائزہ بھی لیا جس نے شرکاء کو مثبت اقدام اٹھانے پر ابھارا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا کہ شرکاء تحقیق نے کسی بھی ایسے دباؤ سے نمٹنے کے لئے کیا طریقہ کار اپنایا۔ تجزیہ کے اس حصہ میں شریک تحقیق کا اس کی زندگی سے جڑی ہوئی خواتین کے ساتھ تعلقات کا جائزہ بھی لیا گیا۔ شرکاء کی زندگیوں میں کس طرح مردانگی کی تشریح کی گئی اور یہ

تشریحات کس طرح روزن کے کام اور طریقہ کار سے جڑتی ہیں، ان سب باتوں کے درمیان موجود ممکنہ تعلقات کی نشاندہی بھی کی گئی۔

سہ گونہ پڑتال (Triangulation)

ابتدائی تجزیہ کو تحقیقاتی ٹیم کے ساتھ شیئر کیا گیا اور ان کی رائے لی گئی۔ اس تحقیق سے مزید جہتیں نکل کر سامنے آئیں۔ یہ پہلے درجہ کا تجزیہ تمام ٹیم ممبران کے ساتھ ایک میٹنگ کے دوران شیئر کیا گیا اور اس دوران وقتاً فوقتاً ریکارڈ کردہ انٹرویوز کو بھی سنا گیا اور بوقت ضرورت ٹرانسکرپشن کو بھی پڑھا/سنا گیا۔ دوسرے درجہ کا تجزیہ ڈسکشن کے ذریعے کیا گیا اور اسے بھی تمام ممبران کے ساتھ شیئر کیا گیا تا کہ ان کی رائے لی جا سکے۔

ٹائم لائن

اس تحقیق کو مئی 2010ء میں شروع کیا گیا اور یہ اپریل 2012ء میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ اس تحقیق کے حوالے سے ایک بڑا چیلنج مناسب تحقیقاتی ٹیم کا انتخاب، ان کی ٹریننگ اور اس ٹیم کو قائم رکھنا تھا۔ 'صفائی تحقیق' کے لئے محقق کی وسیع البنیاد تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر پاکستان کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہاں بالعموم 'صفائی تحقیق' کرنے والوں کی شدید کمی ہے اور بالخصوص لائف ہسٹری تحقیق کے حوالے سے تو افراد کی شدید قلت ہے۔

اس تحقیق کے لئے مئی 2010ء میں سٹاف بھرتی کیا گیا۔ ان کی دو ماہ تک 'صفائی تحقیق' کے مختلف طریقوں اور ریسرچ پروپوزل بنانے کے حوالے سے تربیت ہوئی۔ تحقیقی خاکہ (Research Design) دسمبر 2010ء تک مکمل کر لیا گیا تھا اور اس کے بعد دو ماہ تک تحقیقی موضوع سے متعلقہ موجودہ مواد کا کثیر مطالعہ کیا گیا۔ بعد ازاں سکریننگ گائیڈ لائن، ضابطہ اخلاق اور انٹرویو گائیڈ بنائی گئی۔ مئی 2011ء میں معلوماتی خط لوگوں کو بھیجا گیا۔ ابتدائی چھان بین کا عمل جون 2011ء میں شروع ہوا۔ جیسے ہی شرکاء کا انتخاب ہو گیا تو اگست تا دسمبر 2011ء تک انٹرویوز کیے گئے جبکہ ٹرانسکرپشن اور تجزیہ ستمبر 2011ء سے مارچ 2012ء تک جاری رہا۔ دریں اثناء کہانیاں لکھنے کا عمل بھی جنوری تا اپریل 2012ء کے عرصہ میں مکمل کیا گیا۔ حتمی تحقیقی رپورٹس اردو اور انگریزی زبانوں میں جون 2012ء میں شائع ہوئیں۔

تجزیہ سے بیان کی طرف

کول اور نولز کے مطابق لائف ہسٹری تحقیق (جو کہ صفائی تحقیق کا ایک طریقہ ہے) میں اہم یہ ہے کہ تحقیقی عمل ''زندگیوں کی بیانی نوعیت'' پر فوکس کرتا ہے (ص: 20)۔ اس میں خود نوشت کا عنصر نمایاں ہوتا ہے جس میں جمالیاتی ذوق موجود ہوتا ہے۔ کسی فرد کی ذات اور اس سے جڑے ہوئے واقعات کی توقیر کا خیال بھی رکھا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس بات کو

بھی ذہن میں رکھا جاتا ہے کہ کسی شریک کی زندگی کو کہانی کی صورت میں لکھنے میں کی گئی تشریحات (جو کہ حاصل کردہ ڈیٹا کی ہوتی ہیں) کا انحصار محقق کے اپنے اندازِ مشاہدہ اور مہارتِ تجزیہ پر ہوتا ہے۔ جب ہم کسی ٹکڑے (کہانی) کو بار بار لکھتے ہیں تو یہ اس متن کا حصہ بن جاتا ہے جو کہ ہمیں شرکاء کی زندگی سے جڑے ہوئے واقعات / تجربات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ بات رچرڈسن (2004) کے خیالات ''لکھنا بطرز جاننا'' سے ملتی جلتی ہے۔ درحقیقت ہمارے ذہن میں یہ بات تھی کہ اس تحقیق کو قارئین کے لئے دلچسپ اور قابل فہم بنایا جاسکے۔ ہم چاہتے ہیں کہ پڑھنے والے اس سے جڑاہُوا محسوس کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس تحقیقی کام کو نہ صرف سنجیدگی سے دیکھا جائے بلکہ اس کی جائز اہمیت کا اقرار بھی ہونا چاہیے۔ کہانی کی صورت میں لکھنے سے قارئین شرکاء کی زندگیوں کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں کہ وہ لوگ کن حالات سے گزرے اور انھی کے پس منظر کو محسوس کرتے ہوئے شرکاء کی زندگیوں کو سمجھا جاسکتا ہے۔ جب ہم نے کہانی کی صورت میں لکھا تو ہم نے سیکھا کہ ''مختلف طریقوں سے لکھنے سے ہم نے اپنے موضوع کے بارے میں نئے پہلوؤں کو دریافت کیا۔ پس ہیئت اور متن کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا'' (رچرڈسن، 2009، ص:473)۔ لوری نیلسن بھی اس بات کا اقرار کرتی ہے اور کہتی ہے ''جاننا اور علم فکشنز ہیں جیسا کہ فکشن جاننا اور علم ہے'' (ص:208)۔ یہ تحریر اس کام کے پیرائے میں لکھنے کے حوالے سے ایک نیا نظریہ ''بتانا اور بتایا گیا ایک ہی رہتا ہے'' تشکیل دینے کے بارے میں راہ نما بن گئی ہے۔ الفاظ کی کوئی بھی ایسی ترتیب نہیں پائی جاتی جو غیر جانبدار اور معصوم ہو۔ ''تحریر ہمیشہ جانبدار، مقامی پس منظر رکھنے والے حالات سے اثر انداز ہونے والی اور۔۔۔ ہماری ذات اس سے جُڑی ہوتی ہے'' (رچرڈسن، 2004: ص480)

اہم واقعات کی نشاندہی کے لئے ہر ٹرانسکرپشن کو متعدد بار پڑھا گیا۔ تجزیہ (درجہ دوم) کی روشنی میں زندگی کے اہم واقعات (جو کہ بنیادی تحقیقاتی مقاصد کے ساتھ مطابقت رکھتے تھے) کی نشاندہی کرتے ہوئے کہانیاں لکھی گئیں۔ کہانیوں کو دلچسپ اور پرکشش بنانے کی خاطر شروع میں ایک پیراگراف کی صورت میں مثبت اقدام کے بارے میں بتایا گیا۔ بعد ازیں کرداروں کا تعارف ہے اور اس کے بعد قاری کہانی کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ کہانی میں شریک تحقیق کی زندگی کے کس بھی اہم واقعہ کے بیان سے قبل تحقیقاتی ٹیم کی آراء دی گئیں ہیں۔ کہانیاں ان تمام اہم واقعات اور باتوں کا احاطہ کرتیں ہیں جن کا تعلق مردانگی، مثبت اقدام یا اس کے اسباب ومحرکات سے ہے۔

قارئین کو مدنظر رکھتے ہوئے تمام کہانیاں اردو زبان میں لکھی گئیں۔ سب کہانیاں متعلقہ شرکاء اور روزن سٹاف سے شئیر کی گئیں تاکہ وہ اپنی رائے دے سکیں۔

ابتداً کچھ بھی اس ترتیب سے نہیں لکھا گیا تھا جس طرح اب پیش کیا جارہا ہے۔ شرکاء نے اپنے تجربات بھی کسی یک رخی طریقے سے نہیں بتائے۔ اس کے باوجود یہ سب جاننا ایک دلچسپ عمل رہا جس کے دوران بات چیت کے ساتھ ساتھ

لکھنے کا کام بھی رہا۔ ہمارے لئے سب سے اہم یہ ہے کہ کہانی کس طرح بیان کی گئی۔ باقی ہم یقین رکھتے ہیں کہ قارئین ان کہانیوں کو پڑھتے ہوئے شرکاء کے تجربات سے کچھ نہ کچھ جڑا ہُوا محسوس کریں گے اور ان تجربات سے جُڑے جذبات کا خیال بھی رکھیں گے۔ ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ لازم نہیں کہ کسی شخص میں صرف یہ کہانیاں پڑھ کر کوئی بہت بڑی تبدیلی رونما ہوجائے گی اور وہ کوئی خاص اقدامات کرے گا تاہم یہ ہوسکتا ہے کہ وہ مختلف طریقے سے سوچنا شروع کردے۔ ہمارا مقصد تحقیق کو مختلف لوگوں اور معاشروں کے مطابق ڈھالنا اور ان کی زندگیوں کے ساتھ جرأت پیدا کرنا ہے۔ اسی تناظر میں ان کو اردو اور انگریزی زبانوں میں لکھا گیا۔

عکاسیت

'صفاتی تحقیق' کے عمل کے دوران مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرنا نہ صرف معیارِ تحقیق کو بہتر کرنے میں مدد دیتا ہے بلکہ اخلاقی طور پر بھی یہ ایک لازمی جزو ہے۔ عکاسی کرنے سے تحقیقی خاکے، طریقۂ کار، اور تجزیہ کے حوالے سے بھی بہتر فیصلے کرنے میں راہ نمائی ملتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ عمل دیگر افراد کو محقق کا طریقۂ کار سمجھنے اور تحقیق کی جانچ پڑتال میں بھی مدد فراہم کرتا ہے۔

اس تحقیق کے دوران پیش آنے والے کچھ چیلنجز کی عکاسی کے حوالے سے ذیل میں چند باتیں درج کی گئی ہیں:
ہم سمجھتے ہیں کہ دستیاب وقت اور وسائل میں کمی کے باوجود ہمارا تحقیقی طریقۂ کار نہایت کارآمد ثابت ہوا اور اس کی مدد سے زیرِ تحقیق سوالوں کا ممکنہ تفصیلی جواب حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی۔ اگر ہمارے پاس مزید وقت اور وسائل ہوتے تو یقیناً ہم اس تحقیق کا دائرہ کار مزید پھیلا سکتے تھے۔ ہر شریکِ تحقیق کے ساتھ زیادہ وقت گزارتے اور ان کی زندگیوں کے ساتھ منسلک اہم لوگوں سے بھی انٹرویو کرتے۔ اس کے علاوہ ہم ان متاثرہ افراد سے بھی ملتے جن کے حوالے سے شرکاء نے مثبت اقدامات کیے۔

کہانیاں لکھتے وقت شرکاء کی باتوں اور خیالات کی بعینہٖ عکاسی کی غرض سے بہت ساری جگہوں پر ان کے الفاظ بحالت اصل شامل کیے گئے۔ اس وجہ سے جملوں کی ترتیب اور تناسب متاثر ہوا۔ محدود وقت میسر ہونے کی وجہ سے اس کو زیادہ سے زیادہ رواں اور سہل بنانا بھی ایک چیلنج رہا۔

لمبے عرصے تک بار بار مرتبہ ایک ہی شخص کی زندگی کے حوالے سے واقعات کو پڑھنا اور لکھنا بسا اوقات تحقیقاتی ٹیم کے کچھ ممبران کے لئے شدید ابتلاء کا باعث بھی بنا۔ تاہم اس احساس کو کم کرنے کی غرض سے ٹیم ممبران آپس میں کام تبدیل کر لیتے تھے؛ جو شخص کسی ایک کہانی پر کام کرتے ہوئے اکتا جاتا تو وہ اپنا کام دوسرے ساتھی کو سونپ دیتا اور خود دیگر انٹرویوز کو پڑھنا شروع کردیتا۔

تحقیق کے شرکاء پاکستان کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ان کے مابین ثقافتی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی اعتبار سے فرق تھا۔لہذا ایک دوسرے کے حالات کے بارے میں محدود/ مختلف معلومات ہونے کی وجہ سے بسا اوقات شرکاء ،محقق اور تحقیق کا نقطہ نظر سمجھنے میں دشواری بھی پیش آئی۔

شرکاء کے ساتھ اتنی موافقت پیدا کرنا کہ وہ اپنی زندگیوں سے جڑے ہوئے واقعات کو بامعنی انداز میں بیان کرسکیں ایک مشکل امر ثابت ہوا۔ ہر شریک تحقیق کے ساتھ اس حوالے سے گزارے گئے وقت کا دورانیہ مختلف رہا۔مثال کے طور پر سندھی شریک کے ساتھ میل جول پیدا کرنا آسان ثابت ہوا نسبتاً اس شریک کے جس کا تعلق جنوبی پنجاب کے اس علاقے سے تھا جو بلوچستان سے ملحق ہے۔

کسی بھی ایسی صورت حال میں انٹرویو کرنا مشکل ہو جاتا ہے جب کوئی شخص (محقق) اپنے آپ کو ضرر پذیر سمجھ رہا ہو۔ مثال کے طور پر جس سندھی شریک سے انٹرویو کیا گیا اس کا تعلق سندھ قوم پارٹی سے تھا۔وہ پنجاب حکومت کو سندھ کی بدتر صورت حال کا ذمہ دار ٹھہراتا تھا اور واضح طور پر پنجاب حکومت کی پالیسیز اور اقدامات جو کہ سندھ کو متاثر کر رہے ہیں، کے حوالے سے ناپسندیدگی کا اظہار کرتا (اس صورت حال میں محقق کا تعلق پنجاب سے تھا)۔اسی طرح ایک کیس میں شریک تحقیق محقق سے پیشہ ورانہ طور پر زیادہ تجربہ کار تھا۔ایسے حالات میں کسی محقق کے لئے خود کو اندیشوں سے دور رکھنا اور تحقیق پر توجہ مرکوز کرنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔دوران انٹرویوز یا ڈیٹا کو لکھتے وقت (transcription) محقق کی ذاتی زندگی کے کچھ پریشان کن واقعات (مثلاً خاندانی تنازعات وغیرہ) شریک کے بیان کردہ واقعات سے مشابہت رکھتے تھے۔اس صورت حال کی وجہ سے یہ اندیشہ رہا کہ کہیں ان کا اثر ڈیٹا کے تجزیہ اور تشریح میں نہ جھلکے۔

ذاتی مشاہدہ کے دوران بعض اوقات شریک کا کمزور طبقات/افراد کے ساتھ برتاؤ دیکھنے کا موقع بھی ملتا ہے۔جیسا کہ ایک مرتبہ میں (محقق) اور شریک تحقیق، کار میں شہر کی طرف جا رہے تھے کہ اچانک ایک لڑکا تیز رفتار موٹر سائیکل چلاتے ہوئے آیا اور ہماری گاڑی سے کچھ فاصلے پر گر گیا۔جیسے ہی شریک تحقیق نے اس لڑکے کو گرا ہوا دیکھا تو فوراً گاڑی سے اتر کر اس کے پاس گیا۔اسے اٹھنے میں مدد کی اور پوچھا کہ اسے کسی قسم کی طبی امداد کی ضرورت تو نہیں۔

پانچ میں سے چار شرکاء کی عمریں تقریباً میری (محقق کی) عمر جتنی تھیں اور ان کا تعلق غیر سرکاری تنظیموں سے بھی تھا۔اس وجہ سے بھی شاید ان کے ساتھ میل جول بڑھانے اور موافقت پیدا کرنے میں نسبتاً آسانی رہی۔

ایسا بھی تو ہوسکتا ہے۔۔۔
پانچ مردوں کی کہانیاں

یہ ان پانچ مردوں کی کہانیاں ہیں جنہوں نے اس تحقیق کو معنوی وسعتوں سے ہمکنار کرنے کے لئے اپنی زندگی کے گوشوں کو وا کیا۔بیان کردہ حقائق کو کہانیوں کی صورت میں لکھا گیا ہے۔یہ کہانیاں صیغہ واحد متکلم میں ہیں تاہم تحقیقی نقطہ نظر سے شرکاء کی زندگیوں کے کچھ خاص پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے چند مقامات پر محقق کی طرف سے تشریحاتی جملوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔علاوہ ازیں کہانی میں شرکاء کے الفاظ کو بعینہ بیان کرنے کی سعی کی گئی ہے۔اس طرز تحریر کی وجہ سے ممکن ہے کہ قاری کو بعض جگہوں پر ربط اور روانی کے حوالے سے مشکل پیش آئے۔

محمد علی

سکھر شہر کے نواحی گاؤں میں ایک جرگہ منعقد ہوا جس میں علاقے کے وڈیرے اور انتہائی بااثر شخصیت فرمان شاہ نے ایک اہم معاشرتی مسئلے پر فیصلہ سنایا۔ اس مقدمے میں انیس سالہ فاطمہ کی شادی زبردستی اسکے چچازاد سے طے کردی گئی اور بھرے مجمع میں اسے بغیر نکاح کے چچازاد کے حوالے یہ کہہ کر کردیا گیا کہ اسے لے جائے چاہے شادی کرے یا جو بھی کرے ۔ جرگہ فاطمہ کے والدین کی درخواست پر بلایا گیا تھا جہاں انہوں نے الزام لگایا کہ فاطمہ بہت خودسر ہوگئی تھی اور اپنی مرضی سے شادی کرکے انکی عزت داغدار کرنا چاہتی تھی۔

فاطمہ کی منگنی بچپن میں ہی اپنے کزن سے ہوگئی تھی جو پولیس میں ہیڈ کانسٹیبل تھا اور داؤد آباد سے تعلق رکھتا تھا، ان دنوں نندا پور میں اس کی تعیناتی تھی۔ جب فاطمہ کے ارادے کی خبر اس کے گھر والوں اور منگیتر کو ہوئی تو انہوں نے اسے دھوکے سے اس جرگے میں بلایا اور اسی کزن سے شادی کرنے کو کہا مگر فاطمہ نے صاف انکار کردیا۔ فیصلے کے بعد اسکے کزنز (منگیتر اور اسکے بھائی) نے مل کر اس کے ساتھ جنسی زیادتی کی۔ دو مہینے تک انہوں نے اسے اپنے کوارٹر میں بند رکھا اور روز جسمانی اذیت دیتے، اس پر اتنا تشدد کیا گیا تھا کہ اسکی ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور دو مہینے بعد بھی اس کے زخم مندمل نہ ہوئے۔

ایک دن موقع پاکر بہت مشکل سے فاطمہ اس قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی اور اس نے فوری طور پر مدد کے لیے اپنے جاننے والوں سے رابطہ کیا جو اسکے ساتھ رضا کارانہ طور پر سماجی کام کرتے تھے۔ اُن میں سے ایک محمد علی تھے۔ محمد علی نے اپنے دیگر ساتھیوں سے ملکر فاطمہ کو ابتدائی طبی امداد دلوائی، قانونی مدد کے لیے ایف آئی آر درج کروائی اور پھر کراچی میں ایک پناہ گاہ تک رسائی حاصل کرنے میں مدد دی۔ مالی تعاون کی مد میں کچھ رقم اکٹھی کر کے دی اور صحت یابی کے بعد ایک ادارے میں فاطمہ کی ملازمت کا انتظام بھی کیا۔

سکھر صوبہ سندھ کا ایک تاریخی شہر ہے جہاں قدیم زمانے سے لوگ دریا کے کنارے آباد ہیں۔ یہ اگست کی ایک دوپہر تھی جب میں شہر میں داخل ہوا، بس سے نیچے قدم رکھتے ہی گرم ہوا کے جھونکے نے میرا استقبال کیا۔ تیز دھوپ موسم کی شدت میں اضافہ کررہی تھی۔ موٹر سائیکل رکشوں کے شور اور ٹریفک کے رش میں سے ہوتا ہوا میں قاسم گیٹ کی طرف چل پڑا۔ اپنا سامان سنبھالے ابھی چند قدم ہی گیا تھا کہ موبائل کی گھنٹی بجی، "ہیلو! جی سر۔۔آپ کہاں پہنچے ہیں؟" دوسری طرف سے آواز آئی،

"میں ابھی گاڑی سے اترا ہوں اور آپکی ہدایت کے مطابق قاسم گیٹ کے سامنے پہنچ رہا ہوں" میں نے جواب دیا۔

" Sorry میں رش کی وجہ سے تھوڑا لیٹ ہورہا ہوں، آپ پلیز وہیں میرا انتظار کریں۔۔میں بس دو منٹ میں آیا۔۔۔" دوسری طرف سے آواز آئی اور اسی کے ساتھ فون بند ہوگیا اور میں سڑک کے کنارے انتظار کرنے لگا۔ پسینے میں بھیگے لوگ زندگی کی پٹڑی پر رواں دواں تھے، یوں لگتا تھا سب کو کہیں پہنچنے کی جلدی ہو اور جیسے ذرا سی دیر کسی انہونی کو جنم دے دے گی۔ چند لمحوں بعد ایک سفید گاڑی میرے سامنے آکر رُکی اور ایک درمیانی عمر کا شخص تیزی سے

میری طرف بڑھا، اُسنے مجھے سلام کرتے ہی ہاتھ آگے بڑھایا اور کہا "میں علی ہوں، آپ یقیناً صفی اللہ ہیں" میں نے جواب میں تصدیق کی اور اپنا سامان اسکی مدد سے گاڑی میں رکھ دیا۔ یہ علی سے میری پہلی ملاقات تھی، وہ گاڑی خود چلا رہا تھا اُس نے میرے سفر کے بارے پوچھا اور پھر کہا کہ آگے سڑک ٹوٹی ہُوئی ہے اسلیے ہم لمبے مگر آسان رستے سے جائیں گے، وہ سنجیدہ مزاج مگر خوش گفتار شخص معلوم ہورہا تھا، اگلے چند روز میرا زیادہ وقت محمد علی کے ساتھ گزرا اُس نے اپنی زندگی کے بہت سے اہم واقعات تفصیلاً بیان کیے۔ ہماری بات چیت کے آغاز میں اُس نے اپنے بارے میں بتایا:

میرا نام محمد علی ہے۔ میرا تعلق سندھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں خانو سے ہے۔ میری عمر 37 برس ہے۔ میرے گاؤں کی عمر بھی کوئی 70-60 برس ہے۔ ہمارے آباؤاجداد دریا کے کنارے آباد تھے کہ ایک سال سیلاب کی وجہ سے سارا علاقہ ڈوب گیا اور پھر انہوں نے بالائی علاقے میں جھوک خانو کے نام سے گاؤں آباد کرلیا۔

میرے والد کا نام کلیم اللہ تھا اور والدہ کا عائشہ۔ ہم تین بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ جن میں سے سب سے بڑے بھائی وفات پاچکے ہیں۔

ایک مرد ہونے کے ناطے محمد علی جن کرداروں سے قریبی طور پر منسلک تھے ان میں سے ایک اہم کردار ان کے والد تھے، جن کا ذکر علی نے یوں کیا:

گاؤں میں میرے والد کی کریانے کی اچھی خاصی بڑی دکان تھی۔ سب میرے والد کو سیٹھ صاحب کہا کرتے تھے۔ میرے والد ہمیں اکثر بتایا کرتے تھے کہ انہوں نے یہ سب کتنی محنت سے بنایا ہے۔ ریلوے میں جو سب سے کم تر ملازمت ہوتی ہے وہ کرتے تھے ان کی کوئی مستقل ملازمت نہیں تھی۔ بلکہ ریلوے کے ٹھیکیدار دیہاڑی کے طور پر ان سے ریلوے کی پٹڑی سیدھی کروایا کرتے تھے۔ ان کا کام پٹڑی پر بجری ڈالنا ہوتا تھا۔ اپنا سارا دن وہ روکھی روٹی کے اک تہائی ٹکڑے پر گزارتے جسے پانی میں بھگو کے کھالیا کرتے تھے۔

دن رات محنت کر کے انہوں نے کاروبار بنایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے والد بہت سخت دل اور کنجوس بھی تھے۔ ان کا رویہ تمام گھر والوں کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ مثال کے طور پر وہ میری ماں کو بہت مارتے تھے۔ حالانکہ وہ اپنے شوہر سے بہت محبت کرتی تھی۔ ان کی ہر بات مانتی، اک وفادار اور فرمانبردار بیوی تھی۔ گھر میں حالات خراب ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے والد کی بہن میری ماں کی بھابھی بھی تھی یعنی کہ بدلے کی شادی ہوئی تھی۔ ان کے گھر کے اختلافات اکثر اوقات ہمارے گھر کے حالات کو کشیدہ رکھتے تھے۔ اپنا غصہ نکالنے کے لئے وہ بچوں کو بھی نہیں چھوڑتے تھے۔ یعنی ہماری بھی پٹائی عام معمول تھا۔

خرچے کے معاملے میں ان کو بہت غصہ آتا کیونکہ وہ گھر کا مقرر کردہ راشن بھی تول کر دیتے تھے۔ مثال کے طور پر روزانہ کا تین کلو آٹا تول کر دیتے۔ وہ کبھی بھی پورے مہینے کا راشن اکٹھا نہیں دیتے تھے۔ اگر روز تین کلو آٹا خرچ ہوتا تو تین کلو ہی ملتا۔ اگر کبھی زیادہ مانگ لیا تو انہیں غصہ آجاتا کہ آج زیادہ کیوں چاہیے۔ انہیں یہ شک رہتا تھا کہ ان کی بیوی کچھ بچا کے اپنے ماں باپ کو دیتی ہے یا دے دیگی۔ حالانکہ میری نانی کا گھر قریب ہی تھا اور سب جانتے تھے کہ وہ بہت سوشل عورت ہے اور انکا تعلق کافی خوشحال گھرانے سے تھا۔

میرے والد اور میرے سب سے بڑے بھائی کے تعلقات کبھی خوشگوار نہیں رہے۔ اس کے برعکس میرے جو دوسرے نمبر

کے بھائی ہیں وہ پیدائشی طور پر تھوڑے جسمانی معذور ہیں اور ان کی طبعیت بالکل میرے والد کی طرح تھی۔ یہی وجہ تھی وہ ان کو بہت پسند کرتے تھے۔ ان دونوں کی آپس میں بہت بنتی اور میرے والد اس سے سب گھر والوں کی روزانہ کی رپورٹس بھی لیتے تھے۔ جب کہ میرے بڑے بھائی ان دونوں سے رویے اور سوچ کے لحاظ سے مختلف تھے۔ وہ بہت زندہ دل اور دوستوں کے دوست تھے۔ میں آج جہاں بھی ہوں جو بھی ہوں اس سب میں میرے بڑے بھائی کا بہت حصہ ہے۔

باپ اور بھائی کا جو تضاد علی نے بچپن میں پایا اسکا گہرا مشاہدہ کیا اور محسوس ہوتا ہے کہ اسکی تلخیاں ان کے ساتھ بدستور موجود ہیں۔ اپنے بڑے بھائی کا تعارف کرواتے ہوئے علی نے کہا:

میرے بڑے بھائی کا نام شہاب تھا وہ کئی سال پہلے گھر چھوڑ کر گئے تھے اور اب تک اُنکے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ وہ ہمارے گاؤں کے پہلے فرد تھے جنہوں نے میٹرک کیا اور پھر ایف اے کے بھی امتحانات دیئے۔ اس وقت کے لحاظ سے اتنی تعلیم بہت بڑی بات ہوتی تھی۔ اس کے بعد انہیں 'ہلال پاکستان' میں 1984-1975 نوکری کی۔ اس وقت کا سب سے بڑا اسندھی اخبار ہوا کرتا تھا جس میں امر جلیل جو اس وقت کے بہت بڑے لکھاری اور ڈرامہ نگار تھے، اس اخبار میں لکھا کرتے تھے۔ میرے بھائی کا آرٹیکل ان کے ساتھ چھپتا تھا۔ میرا بھائی بہت ہی قابل انسان تھا لیکن وقت اور حالات نے اسے شاید زیادہ مشہور ہونے کا موقع نہ دیا۔ وہ باہر نکلتا تو لوگ اس کے اردگرد ہوتے۔ والد صاحب کے ساتھ دکان پر بھی بیٹھتا تھا۔ جب وہ دکان پر ہوتا تو دوست یار آجاتے، پھر چائے کا سلسلہ چلتا کوئی ٹافی کھا رہا ہے کوئی بسکٹ تو والد صاحب اس سے بہت ناراض ہوتے اور اس کی دوستوں کے سامنے بے عزتی کر دیتے یا اس کو سب کے سامنے مارنا شروع کر دیتے۔ والد صاحب کے اس رویے کی وجہ سے اکثر وہ روٹھ کر گھر بتائے بغیر دو دو تین تین مہینے کے لیے چلا جاتا۔ میری ماں رو رو کر ہلکان ہو جاتی، اس زمانے میں فون تھا اور نہ ہی رابطے کا کوئی ذریعہ۔ پھر وہ کچھ عرصے کے بعد واپس آجاتا تو والد اس سے اپنا رویہ تھوڑا بدلتے۔ میرے بھائی کے بہت سے قلمی دوست تھے۔ اس زمانے میں روزانہ اس کے قلمی دوستوں کے خط آتے۔ وہ بہت ادبی بندہ تھا لیکن میرے والد اس سے کبھی خوش نہیں ہوتے تھے۔ تھوڑا عرصہ اپنا رویے بدلتے پھر ویسے ہی اس کی تذلیل شروع کر دیتے۔ اس کے دوستوں کو بھی کہتے اٹھو بھاگو یہاں سے آجاتے ہو یہاں وقت ضائع کرنے ناکارہ کہیں کے۔ ایک دفعہ میرا بھائی ناراض ہو کر چلا گیا چھ مہینے تک کوئی خبر نہیں ملی اس کی۔ جب دو تین مہینوں تک اس کی خبر نہیں آئی تو میرے والد بھی پریشان ہو گئے۔ وہ ڈھونڈنے کے لیے گئے لیکن نہیں ملا۔ حالانکہ وہ اخباروں میں اس وقت لکھ رہا تھا۔ جب کہیں بھی کوئی خبر نہ ملی تو وہ دکان بند کر کے اسے ڈھونڈنے نکل پڑے۔ کوئی آ کر کہتا ہم نے ہوٹل میں دیکھا تھا کوئی کہتا کہ کوئٹہ میں کام کر رہا تھا۔ کوئی کہتا وہاں دیکھا تھا مگر سب اندازے غلط تھے۔ تقریباً چھ ماہ کے بعد ایک دن وہ خود ہی واپس آ گیا۔ بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ سب محلے والے جمع ہو گئے اور اس سے پوچھنے لگے کہاں گئے تھے۔ کیوں گئے تھے؟ اتنا عرصہ کہاں تھے؟ پر وہ خاموش رہا یا کبھی زور زور سے ہنسنا شروع کر دیتا اور کبھی رونا۔ محلے والوں نے کافی کوشش کی اس سے بات کرنے کی پر وہ کچھ نہیں بولا چپ کر کے بیٹھا رہا۔ وہ لوگ بھی تھک ہار کر چلے گئے۔

یہ ضرور ہوا کہ کچھ دن تک میرے والد کا رویہ نرم ہوا لیکن پھر تھوڑے عرصے بعد اپنی پرانی روٹین پر آ گئے۔ مجھے آج بھی ایک رات یاد ہے۔ سردیوں کی رات تھی، بہت بارش ہو رہی تھی۔ ہم سب گھر والے کھانا کھا رہے تھے۔ تو اسی حالت

میں میرے والد نے اسے مارنا شروع کر دیا کہ دوستوں کو کھلاتا ہے۔ پیسے کو ضائع کرتا ہے۔ تو اسے چپ لگ گئی۔ ظاہر ہے بائیس سال کا جوان تھا وہ اس نے تین دن کچھ نہیں کھایا اور پھر وہ ایک مرتبہ پھر گھر سے چلا گیا۔ والد نے سوچا آجائے گا واپس مگر وہ پھر نہیں آیا۔ گھر میں ماں، بہنیں رو رو کے نڈھال ہو گئیں۔ ظاہر ہے جوان اور خوبصورت بیٹا تھا۔ مجھے ایک بات اپنے بھائی کی آج بھی یاد ہے۔ سردیوں کی رات تھی۔ میں شاید پڑھ کے سونے لگا تو اس نے مجھے پیار سے کہا ''شوقین!'' وہ مجھے پیار سے شوقین کہا کرتے تھے۔ بات سنو! سردی کی رات تھی ہم دونوں نے رضائی لی ہوئی تھی۔ بولے ''سنو! پتہ ہے میں کیوں واپس آیا ہوں، میں صرف تمہارے لیے واپس آیا ہوں کل چلا جاؤں گا''۔ وہ رو رہے تھے اور ان کے گرم گرم آنسو میرے سر پر گر رہے تھے۔ پھر وہ واقعی چلا گیا اور کبھی واپس نہیں آیا۔ میری ماں رو رو کے اندھی ہو گئی۔ پچیس سال ہو گئے ہیں انہیں گئے ہوئے مگر مجھے آج بھی وہ اسی طرح یاد ہے۔ اس کے دوست اب بھی اسے یاد کرتے ہیں۔

یہ کہہ کر محمد علی کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ خاموش ہو گئے، ضبط کے باوجود وہ رو پڑے، انھوں نے اپنا چہرہ جھکا لیا جیسے میرے سامنے رونا نہ چاہتے ہوں، وہ ایک ہاتھ سے آنسو پونچھ رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ وقفے وقفے سے Sorry کہتے تھے۔ چند لمحوں کے لیے ماحول پر سکوت طاری ہو گیا انھوں نے ایک لمبی آہ بھری اور کہنے لگے:

زندگی کا رخ اس وقت بالکل تبدیل ہو گیا جب والد کی وفات ہوئی۔ اس وقت میں پانچویں کلاس میں پڑھ رہا تھا، میری عمر کوئی دس یا گیارہ سال کے قریب ہو گی۔ میرے چاچا نے میرے والد کی دکان اور زمین پر قبضہ کر لیا۔ میرے چاچا ریڑھا چلاتے تھے۔ میرے والد نے گھر بنانے کے لیے انہیں اپنے گھر کے سامنے زمین دی تھی۔ اسی طرح میرے دوسرے چاچا نے میرے والد کی دوسری دکان پر بھی قبضہ کر لیا لیکن وہ اسے چلا نہ سکے اور دکان بند ہو گئی۔ چونکہ میرے والد نے میرے چاچا کا گھر ہمارے گھر کے بالکل آگے بنوایا تھا گھر کا نقشہ کچھ اس طرح تھا کہ گھر کے دروازے ایک تھے اور ہمیں ان کے گھر سے گزر کر اپنے گھر آنا پڑتا تھا۔ میرے والد کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کے بھائی ایسا کچھ کریں گے۔ پھر جب والد فوت ہو گئے اور دکانیں بھی چلی گئیں تو میرے چاچا نے ہم سے کہا کہ بھئی اب اپنے گھر کے دروازے کا بندوبست کرو اور انہوں نے راستے بند کر دیئے۔ میرا دوسرا بھائی مجھ سے ایک ہی سال بڑا ہے اس وقت اس کی عمر بھی ایسی نہیں تھی کہ وہ انہیں کچھ کہتا۔ پھر ایسا ہوا کہ پہلے تھوڑے تھوڑے اختلافات ہوئے۔ پھر رنجشیں بڑھیں اور ایسا ہوا کہ اگر کبھی ہم کسی کام کے سلسلے میں باہر جاتے اور گھر آتے ہوئے دیر ہو جاتی تو چاچا دروازہ اندر سے بند کر دیتے۔ ہم بچے تھے چاچا کو کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے ہم ان سے بہت زیادہ ڈرتے تھے۔ ہم کئی کئی گھنٹوں تک دروازہ بجاتے رہتے لیکن وہ نہ کھولتے۔

حالات اتنے خراب ہو گئے تھے کہ ایک دن ایسا بھی آیا کہ جس سکول میں مَیں پڑھنے جاتا تھا وہاں مَیں چھولے بیچنے گیا۔ ماں نے کہا کہ کچھ بھی کرو تا کہ دو وقت کی روٹی میسر آ سکے اس وقت اتنا برا نہیں لگا لیکن اب محسوس ہوتا ہے اور شرمندگی بھی ہوتی ہے کہ میں وہیں پڑھتا تھا اور وہیں یہ کام بھی کرنا پڑا۔ اسی طرح زندگی کے تلخ ایام گزرتے رہے۔ اپنے چاچا کے سامنے ہم اس طرح سے رہتے تھے جیسے غلام ہوتے ہیں۔ پھر انہوں کہا کہ یہ بھی میرے بچے ہیں اور انکی شادی میرے ذمے ہے اور میرا اور میری بہن کا رشتہ بغیر رضامندی کے اپنے ہی بچوں کے ساتھ طے کر دیا۔ ہم

نہیں سمجھے اور ویسے بھی انکار کی گنجائش کہاں تھی۔ میری بڑی بہن اور میری بدلے کی شادی ہوگئی۔ میری تینوں بہنیں مجھ سے بڑی تھیں لیکن میری شادی ہوگئی۔ اسی طرح پانچ سال تک میں نے چھولے بیچے۔ پھر مزدوری بھی کی کوئلے کی کان میں پتھر بھی توڑے کچھ عرصے بعد ایک ریڑھا لگا لیا جس میں بچوں کی ٹافیاں وغیرہ بیچتا تھا میرا کاروبار کافی چل گیا پھر ریڑھے سے بڑھ کر دکان بن گئی۔ عمر کے ساتھ ساتھ عقل بھی آنے لگی۔ اس دوران مَیں وقت گزارنے کے لئے بڑے بھائی کی گھر میں پڑی ہوئی کتابیں، رسالے، کہانیاں اور ڈائجسٹ پڑھنے لگا۔

محمد علی نے اپنے تعلیمی ماضی کا نہایت دیانتدارانہ نقشہ پیش کیا، وہ بتاتے ہیں:

میں نے نویں کا پرائیویٹ امتحان دیا۔ یہاں میں ایک وضاحت کردوں کہ پرچے میرے کزن نے دیئے تھے اور میں اے گریڈ میں پاس ہوا۔ پھر اس کے بعد میں نے ایف اے کا بھی امتحان دیا لیکن نقل وغیرہ کر کے اپنے کلچر کے مطابق خود ہی دیئے۔ میں کبھی کالج نہیں گیا پر میں سب پرچوں میں پاس ہوگیا۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا تھا کہ بس جا کر بیٹھ جاتا تھا اور ارد گرد والوں سے پوچھ کر پرچہ حل کر لیتا تھا۔ پھر میں نے ایم اے سوشیالوجی کیا۔ پھر ایل ایل بی کیا۔ ساتھ ساتھ بھائی کی چیزیں پڑھ کے شوق پیدا ہوا اور میں نے بھی رسالے اور ڈائجسٹ خریدنے شروع کر دیئے۔ پھر اسی دوکان میں بیٹھے بیٹھے میں نے قلمی دوستیاں بھی بنائیں۔ پھر خط لکھتے لکھتے میں نے اخباروں اور رسالوں میں لکھنا شروع کر دیا۔ اس میں ایک کالم ہوتا تھا قارئین کی آراء، اس میں بھی لکھا۔ پھر امر جلیل جن کا میں نے پہلے بھی ذکر کیا تھا، ان کا مرید ہوگیا۔ پھر اک دن میرا سندھ کے سب سے بڑے اخبار کاوش میں آرٹیکل چھپا تصویر کے ساتھ، بس یوں ہوا کہ مجھے جنون ہی ہوگیا گویا لکھنے پڑھنے کا۔

اپنی ابتدائی کامیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے محمد علی بہت پرجوش اور پرمسرت تھے، انھوں نے اسی ولولے سے کہا کہ میرے پاس اپنے تمام آرٹیکلز محفوظ ہیں اور میں آپکو انکی کٹنگز دکھاؤں گا، پھر محمد علی نے ایک دلچسپ بات کی:

جنوں کا یہ عالم تھا کہ دکان کھلی ہوئی ہے لوگ آرہے ہیں چیزیں لینے تو میں کہہ دیتا نہیں ہیں حالانکہ پڑی ہوتی تھی۔ میں لکھنے یا پڑھنے میں مگن ہوتا تھا گاہکوں کے آنے سے تسلسل ٹوٹ جاتا تھا۔ مجھے ہوش ہی نہیں تھا کہ بچے آرہے ہیں، چوریاں ہورہی ہیں، آہستہ آہستہ دکان خالی ہونے لگی۔

جب میری شادی کرائی گئی تھی تو مجھے اس وقت شادی میں کچھ خاص رغبت نہیں تھی۔ کچھ عمر کا تقاضا بھی تھا لیکن بنیادی وجہ وہ نفرتیں تھیں جو بچپن میں میرے مشاہدے میں آئیں۔ میرے بہنوئی میری بہن کو بہت مارتے تھے لیکن میں نے کبھی اپنی بیوی کو نہیں مارا۔ کچھ گھر کا ماحول بھی انہوں نے ایسا بنایا تھا کہ ہم سب ڈرتے تھے ان سے۔ وہ مجھے جسمانی طور پر اتنا مارتے تھے کہ میرے لیے چلنا بھی دوبھر ہوجاتا تھا۔ کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ میرے بھی حقوق ہیں۔ اگر میرے اندر یہ ڈر نہ ہوتا تو شاید میں بھی اپنی بیوی کو مارتا پیٹتا لیکن میں نے اسے کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ پھر گھر میں ایسے حالات نے جنم لیا کہ مجھے اپنی بیوی کو طلاق دینا پڑی اور یوں میری بہن کی بھی طلاق بدلے میں ہوگئی۔ زندگی پھر ایک نئے موڑ پر آگئی۔ ہوا یہ کہ ہمارے گھر کے ساتھ ایک دور کے رشتے دار کا گھر تھا ہمیں کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا کہ یہ بھی ہوسکتا ہے۔ ان کا ایک بیٹا میرے بڑے بھائی کا دوست تھا تو ایک دن انہوں نے کہا کہ ہم یہاں نہیں رہتے تو آپ ایسا کرو کہ یہاں سے دیوار گرا کے اندر سے مین روڈ تک گلی بنالو۔ تھوڑا دور ہوگا لیکن آسانی ہوجائے گی آپ لوگ دیوار کا خرچہ اٹھا لو۔ تو یہ ہمارے لیے ایسا ہی تھا جیسے مسئلہ کشمیر حل ہوگیا ہو۔

گاؤں کے ماحول میں معاشی طور پر کمزور ہونے کے باوجود محمد علی نے اپنے اردگرد جس سماجی مسئلے کو محسوس کیا اس کا برملا اظہار کیا اور بدلے میں جاگیردار و مؤثر افراد اور گروہوں سے مخالفت بھی مول لی۔ اس واقعے کے بعد محمد علی کی زندگی میں معاشرتی ناہمواریوں کے خلاف جدوجہد شروع ہوتی نظر آتی ہے اور وہ خود اسکو ایسے بیان کرتے ہیں:

باقی شعور آنے کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب آزادی ملی نئی راہیں نظر آنے لگیں۔ سوچنے کا طریقہ مختلف ہوا۔ بس یہی دور تھا جب میں اخباروں میں لکھ رہا تھا لیکن اس میں بھی بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ شروع شروع میں جذباتی طور پر اخبار میں کچھ ایسا لکھ دیتا کہ لوگ لڑنے مارنے پہ آجاتے، کہ یہ کیا لکھ رہے ہو۔ ایک دفعہ تو ایسا ہوا کہ جرگہ میں مجھے پورے گاؤں سے معافی صرف اس وجہ سے مانگنی پڑی کہ میں نے اخبار میں اک آرٹیکل لکھا کہ گاؤں میں فحاشی کا اڈا ہے۔ کچھ ڈاکٹرز کے کلینک ہیں وہ وہاں پر چرس فروخت کرتے ہیں۔ میں نے ان کے نام بھی شائع کر دیے تو گاؤں والے آگئے کہ یہ کیا کر رہے ہو آپ ایسا کب ہوتا ہے یہاں؟ پھر یہ ہوا کہ گاؤں کا سب سے بڑا وڈیرا اور کچھ دوسرے با اثر لوگ بھی آگئے اور کہا کہ آپ گاؤں کو بدنام کر رہے ہو۔ کہنے لگے او کھلونے بیچنے والے، ٹھیلے لگانے والے تو خود کو معتبر سمجھ رہا ہے۔ ان کے ساتھ پولیس والا بھی تھا اس نے کہا کہ سائیں اس کو ایسے کھینچو کہ آئندہ اس طرح کی حرکت کرنے کی ہمت نہ ہو اسے۔ تو میں نے کہا کہ کیا غلط لکھا ہے؟ آپ بتاؤ میں غلط ہوں کیا؟ میرے پاس ثبوت تھے وہ کچھ اور تو کر نہیں سکتے تھے تو انہوں نے کہا کہ آج سے اس کا سوشل بائیکاٹ ہے، کوئی اس سے بات نہیں کرے گا۔ پھر اسی طرح مجھے موٹیویشن ہوئی مَیں نے گاؤں میں چھوٹے پیمانے پر سوشل ورک شروع کر دیا۔

اسی دوران میں نے اپنے چاچا پر اپنی زمینوں کو واپس لینے کے لیے کیس بھی کر دیا۔ ان دنوں ہمارے علاقے میں اپنے کام اور ایمانداری کی وجہ سے ایک بہت مشہور پولیس والا تھا۔ اس کا نام دین محمد تھا اور وہ ایس پی تھا۔ تو ہوا یہ کہ ایس پی صاحب نے مجھے بلا لیا کہ آپ کے چاچا نے آپ کیخلاف رپورٹ کرائی ہے کہا آپ نے ان پر جھوٹا کیس بنایا ہے۔ یہ سب کچھ چھوڑ دو ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ میرے چاچا ان کے ذریعے مجھے ڈرانا چاہتے تھے تو ایس ایچ او نے میری کافی تذلیل کی تھی۔ لیکن وہ ایس پی بہت شریف بندہ تھا۔ اس پر کچھ عرصہ پہلے میں نے اخبار میں ایک آرٹیکل لکھا تھا بہت تعریفیں کی تھیں میں نے کہ وہ انتہائی شریف، ایماندار، فرض شناس، بہادر آفیسر ہے۔ جب میں نے اسے بتایا تو اس نے کہا کہ بیٹھو چائے پیو اور بہت عزت سے پیش آیا۔ عام طور پر میں پولیس والوں کے خلاف لکھتا تھا پر یہ بہت شریف بندہ تھا رشوت بالکل نہیں لیتا تھا۔ غریب اور امیر کا کوئی فرق نہیں کرتا تھا۔ اس نے مجھے عزت دی، بٹھایا، پورا معاملہ تحمل سے سنا، پھر ایس ایچ او کو فون کیا کہ ابھی ادھر پہنچو جلدی دیر لگائی تو جوتے لگاؤں گا۔ تو جب وہ آیا تو کہا کہ دیکھ لو اس کو آئندہ اگر اسکو تنگ کیا تو تمہاری شامت آجائے گی۔

پھر یہ ہوا میں لوگوں کے مسئلے لے کر زیادہ اس کے پاس جانے لگا، متاثر تو میں ان سے پہلے بھی تھا لیکن اب زیادہ ہوگیا تھا۔ اک دفعہ میں نے ان سے کہا کہ سائیں ہمارے گاؤں میں بہت سے مسئلے ہیں آپ چلیں ہمارے ساتھ، گاؤں میں کھلی کچہری کروائیں تو وہ مان گئے۔ اس سے پہلے یہ تھا کہ میں عام سا رپورٹر تھا، چھوٹے موٹے سوشل ورک کرتا تھا۔ اس زمانے میں صوبیدار کی ٹور ہی اور ہوتی تھی۔ خود کو بہت بڑی چیز سمجھتا تھا وہ، ایس ایچ او اور یا صوبیدار کی بات ہی الگ تھی۔ بادشاہ ہوتا تھا اپنے علاقے کا وہ۔ تو ایس پی کو تو آپ سمجھ لیں نا وہ کیا ہوگا پھر۔ تو جب انہوں نے رضامندی

دی تو میں نے لوگوں میں اناؤنس کیا کہ ایس پی آ رہے ہیں اپنے اپنے مسئلے لے آؤ۔ تو ایس ایچ او میرے پیچھے آیا کہ سائیں یہ مسئلہ ہے، وڈیرے بھی سارے کھڑے ہیں سب کی گاؤں والوں کے سامنے بے عزتیاں ہو رہی ہیں، خیر ان میں سے اب بہت سے میرے دوست ہیں۔ گاؤں میں میرا امیج بدل گیا سب لوگ میری عزت کر رہے ہیں۔ اگر کوئی کیس آیا ہے تو پولیس موبائل مجھے لینے آ رہی ہے۔ مجھے کال کر کے بلا رہے ہیں۔ پھر میں نے ایس پی صاحب کے ساتھ ۳۵ کھلی کچہریاں کروائیں۔ ایس پی نے ریلیف دینا شروع کیا تو لوگ بھی ہمت کرنے لگے۔

اِس سارے کام سے زندگی کا بہت اہم واقعہ جڑا ہوا ہے۔ ایک دفعہ یہ ہوا کہ کسی نے مجھے فون کر کے کہا کہ سائیں آپ ہمارے بھگوان ہیں۔ آپ ہی ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ کہیں سے گزر رہے تھے اور وہاں پر انہوں نے ایک لاش دیکھی ہے کسی خاتون کی ہے اور روڈ کے ساتھ پڑی ہوئی ہے۔ تو میں نے ایس پی کو کال کی انہیں بتایا اس طرح مجھے فون آیا تھا۔ تو انہوں نے پولیس موبائل بھیجی تو کوئی دس، پندرہ منٹ بعد وہ ایک لاش کو لے کر آئے۔ بالکل نوجوان لڑکی تھی وہ دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ شاید کسی کی دلہن ہی ہو، سندھی اجرک میں لپٹی ہوئی تھی۔ کسی نے اس کا گلہ دبا کے مارا تھا اسے اور روڈ پر پھینک دیا تھا۔ پولیس والوں کے لیے وہ روز کا معمول تھا انہوں نے مجھے کہا کہ زیادہ پریشان مت ہو۔ بس اس کا پوسٹ مارٹم کروایا اور دفنا دیا لاوارث کہہ کر کیونکہ کوئی اسے لینے نہیں آیا تھا۔ لیکن وہ اس کی لاش بس میرے دماغ سے چپک گئی تھی۔ پھر یہ ہوا کہ میں نے جب بھی کوئی کام کیا اور زندگی میں تشدد کا کوئی کیس سامنے آیا تو جیسے وہ لاش میرے ذہن میں گھوم جاتی، یہ نہیں کہ صرف عورت کی لاش تھی اس وجہ سے نہیں۔ اگر کبھی کسی مرد کی بھی دیکھتا تو یہی ردعمل ہوتا۔

میں زندگی میں آگے بڑھتا گیا، زندگی چونکہ واقعات کی کڑی ہے اور ہر کڑی دوسری سے ملی ہوتی ہے۔ تو ہوا یہ کہ انہی دنوں میں روہڑی میں ہمارے ایک دور کے رشتہ دار کی شادی تھی۔ پتہ نہیں عجیب سے کشش تھی ایک لڑکی میں، کہ میں کھنچتا چلا گیا تھا اس کی طرف، دو دن ہم لوگ وہاں پر رہے، میں اس کو دیکھتا اور وہ مجھ کو پر ہم نے آپس میں کوئی بات تک نہ کی۔ لیکن ہم نے رسمی بات چیت کی کوشش بھی نہیں کی۔ میں بار بار بہانے سے اندر جاتا اور اپنی بہن کو کہتا کہ اسکو بھیجو، اس وقت چونکہ موبائل نہیں ہوتا تھا کیونکہ آج کل کی طرح نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت آج جیسی جنونی محبت نہیں ہوتی تھی۔ کہ بس لڑکی کو پھنسانا ایسا نہیں تھا۔ پھر جب میں ایک دو دفعہ بہانے سے اندر گیا تو گھر کے تو جیسے اسے پتہ چل گیا، جب تیسری بار گیا تو وہ وہیں پر کھڑی تھی گلی میں کہ جیسے اسے پتہ ہو کہ یہاں آئے گا دوبارہ۔ تو میں نے اس کو کچھ کہا نہ اس نے مجھے۔ ہم دونوں چپک گئے آپس میں، ایک دوسرے کو چومنے لگے۔ اچھا میں آپ کو یہاں اک بات بتاؤں کہ خلیل جبران نے کہا کہ محبت کی پہلی کس کے لئے آپ کو اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مطلب آپ اجازت لے رہے ہیں تو آپ سمجھ لیں کہ آپ محبت کرتے ہی نہیں ہیں۔ ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ آپ سوچیں گے بھی نہیں کہ ہم نے کیا کرنا ہے اور ہم سب کر جاتے ہیں۔ ''پھر میں نے اس کی آنکھیں چومیں اور میں بھاگ گیا جلدی جلدی کہ وہ راستہ تھا، لوگ آ جا رہے تھے۔ بس یہ کچھ سیکنڈوں کا کھیل تھا۔'' وہ چلی گئی اور میں سالوں تک اسے یاد کرتا رہا۔ اس کے تقریباً دو اڑھائی سال بعد کسی رشتہ دار کے ہاں میں اس سے ملا۔ اور ان دو اڑھائی سالوں میں کوئی دن ایسا نہیں تھا کہ مجھے وہ یاد نہیں آئی ہو۔ اس نے مجھے کچھ نہیں کہا اور سب کہہ بھی گئی۔ اسی دوران مجھے شعر و شاعری، اردو ادب، کہانیوں سے

بہت زیادہ رغبت ہو گئی۔ وہ دور تھا کہ میں نے اپنے بھائی کے جمع کردہ میٹریل کو پڑھا۔ کیونکہ وہ ہر وقت ذہن میں رہتی تھی۔ دل کرتا اپنے محبوب کی خوب تعریفیں کروں، لیکن وہ بالکل ایک شریف لڑکی تھی، اس نے کبھی کوئی بات نہیں کی نہ کوشش کی۔ وہ میری کزن ہے لیکن ہم کبھی نہیں ملے، پھر کچھ سال بعد میں روہڑی گیا تو وہاں پر ان کی ماں بیمار تھی، ویسے میں کبھی ان کے گھر نہیں گیا تھا لیکن کسی کے کہنے پر چلا گیا۔ جب میں ان کے گھر گیا تو اس نے میری خوب خاطر تواضع کی، ایسے جیسے کوئی اپنے کسی خاص مہمان کی کرتے ہیں۔ وہ میری اتنی خاطریں کر رہی تھی کہ میرا شک یقین میں بدل گیا کہ آگ دونوں طرف لگی ہوئی ہے۔ ان کے گھر والے سمجھ گئے۔ ظاہر ہے باتیں کرتے ہوں گے کہ کوئی اتنی دلچسپی دکھا رہا ہے اتنی دور سے آ رہا ہے تو انہوں نے ہم سے دوری رکھنا ضروری سمجھی اور پھر ایسا کوئی موقع نہیں ملا کہ ہم دوبارہ ملیں۔ اسی کش مکش میں تین، چار سال گزر گئے، اداسیاں بڑھ گئیں۔ پھر اک دن خبر ملی کہ اس کی شادی ہو گئی ہے میں بہت رویا تھا بہت زیادہ، بہت عرصہ دکھ میں رہا۔ لیکن ہماری طرف سے کوئی رشتہ بھی نہیں گیا تھا ان کی طرف۔ ذہن میں ایسی کوئی بات ہی نہیں تھی کہ شادی کرنی ہے اتنی جلدی، میں اس کو شریک حیات بنانا چاہتا تھا لیکن دھیان بھی نہیں گیا کہ اتنی جلدی ابھی یہ کرنا ہے۔

محمد علی اپنی محبت کا ذکر کرتے ہوئے جیسے کھو گئے تھے، وہ تمام واقعات اتنے انہماک سے سنا رہے تھے جیسے وہ روہڑی میں موجود ہو، ان کا ہر جملہ احساسات سے بھرا ہوا تھا۔ اپنی محبت کو پانے کے حوالے سے انھوں نے کوئی انتہائی اقدام نہیں کیا جو مردوں کے لیے روایتی طور پر عام ہے بلکہ محمد علی اپنی محبوبہ کی شادی ہو جانے پر روئے تھے:

پھر میری بھی دونوں بہنوں کی شادی ہو گئی ہمارے سے نزدیک گاؤں میں پانچ کلومیٹر کا فاصلہ ہے بھیتی باڑی کرتے ہیں۔ محمد یونس نام ہے ان کا، دوسری جو میری بہن ہے درمیان والی ان کی سکھر میں شادی ہوئی ہے۔ ان کی بھی رشتہ داروں میں ہوئی۔ ان کی دو بیٹیاں ہیں بڑی کی اور چھوٹی والی کی اک بیٹی اور ایک بیٹا، اور جو میرے ساتھ تھی ان کے دو بیٹے ہیں۔ میں چونکہ مرد تھا اس لئے میری دوسری شادی ہو گئی۔ لیکن میری سابقہ بیوی اور بہن پہلے جیسی زندگی گزار رہی ہیں۔ میرے چار بچے ہیں دو بیٹیاں اور دو بیٹے۔ بارہ سال ہو گئے ہیں۔ میرے نائب ناظم بننے کی بات ہے۔ میری بیوی زیادہ پڑھی لکھی نہیں لیکن میں ان کو سمجھتا ہوں۔ ان کا رویہ کچھ ایسا ہے کہ میں سب برداشت کر کے عزت و احترام کا رشتہ برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مثال کے طور پر اگر کسی چیز پر ہمارا اختلاف بھی ہو جائے تو میں کوشش کرتا ہوں کہ آواز اور لہجہ نارمل رکھوں۔ تاکہ میرے بچوں پر غلط اثر نہ پڑے کہ ان کا بچپن میری طرح کا نہ ہو اس طرح زندگی آسان گزر جاتی ہے۔ ایک دوسرے کو سمجھ کے دکھ سکھ میں ساتھ دے کر۔ پھر یہ ہوا کہ شہر میں آنے جانے سے مجھے لوکل پارٹیز یونین کونسل کو بھی چھوڑ دیا کیونکہ کا پتہ چلا میرے روابط بڑھے۔ ۲۰۰۵ء میں جب ناظم شپ کا دور ختم ہوا تو میں نے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہاں بھی آپ کے پاس کوئی اختیارات نہیں ہیں۔ آپ لوگوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ اتنے وسائل نہیں کہ ان کے ذریعے لوگوں کی مدد کریں۔ بس اپنے علاقائی اختیارات استعمال کر کے آپ لوگوں کی مدد کر سکتے ہیں۔

پھر دل شکستہ ہو کر میں نے سوشل سرگرمیوں میں دل لگانا شروع کیا۔ سندھ کی ایک تنظیم کمیونٹی گروپس بنا رہی تھی میں اس کا حصہ بنا اور وہاں پر کام شروع کر دیا۔ انہیں دنوں میرے ایک دوست نے ہمیں عزیز آباد، جو سکھر کے قریب ایک گاؤں ہے، وہاں کی ایک لڑکی کا کیس ریفر کیا۔ اس کے سسرال والوں نے اس کی تذلیل کی تھی اور لڑکی کے بال کاٹ کے گھر

سے نکال دیا تھا۔ میرے دوست نے بتایا کہ یہ ماں بیٹی بہت ہمت کر کے پولیس تک پہنچی ہیں تو آپ ان کی مدد کریں۔ کیونکہ مخالف پارٹی بہت طاقتور ہے اور ان کی جان کو خطرہ ہے۔ پھر یہ ہوا کہ میں نے وہاں جا کر لوکل این جی او سے رابطہ کیا جو کہ ہیومن رائٹس کے نام سے کام کر رہی تھی۔ وہاں سے جان پہچان کے بندوں کو لے کر وفد کی صورت میں ہم پولیس اسٹیشن گئے وہاں ان ماں بیٹی کو لے کر ایف آئی آر درج کروائی۔

زندگی تو اچھے اور برے دونوں تجربات کا نام ہے۔ میں نے بھی زندگی میں بہت سے ایسے کام کیے جن پہ فخر ہے اور بہت سے ایسے بھی جن پر آج بھی نادم ہوں میں دل سے۔

محمد علی نے اپنے ہاتھوں کی گئی زیادتی کو نہ صرف دیانتداری سے بیان کیا بلکہ اس پر ندامت محسوس کی اور عملی طور پر اس واقعے کا سبب بننے والے دوست سے کنارہ کشی بھی اختیار کر لی۔ تفصیلات بتاتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

جب میں نائب ناظم تھا تو اس وقت میرے ایک دوست تھے دوسرے گاؤں میں ناظم تھے۔ کافی پڑھے لکھے بھی تھے۔ انہوں نے ایک دن مجھے فون کر کے کہا کہ آپ کی مدد چاہیے۔ آپ جلد از جلد موہان آ جاؤ۔ میرا قریبی دوست تھا میں فوراً چلا گیا۔ وہاں اس نے بتایا کہ اس کا کچھ لوگوں سے جھگڑا ہے اور انہوں نے اسے جھوٹے کیس میں ڈالا ہے اور بے عزتی بھی کی ہے تو بدلہ لینا ہے کیونکہ میں گاؤں میں سر نہیں اٹھا سکتا تو میں نے بھی دوستی میں حامی بھر لی۔ اسی رات ہم لوگ اس بندے کے گھر گئے۔ میں نے دروازہ بجایا۔ وہ اک بوڑھا آدمی تھا جو بنیان میں باہر آیا۔ مجھ سے عمر میں بھی کافی بڑا لگا۔ تو میں نے اور میرے دوست نے اسے مارنا شروع کر دیا۔ اتنا مارا کہ لوگ بھی جمع ہو گئے۔ انہوں نے چھڑوایا۔ وہ شخص بھاگا پولیس اسٹیشن لیکن ایف آئی آر درج نہیں ہوئی۔ کیونکہ میں نائب ناظم تھا اس وقت اور دوست بھی۔ لیکن بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہ بندہ حق پر تھا۔ اس نے سچی گواہی دی لیکن بس دوست نے اتنا بھڑکایا تھا اس وقت کہ سمجھ نہیں پایا۔ پھر بعد میں وہی مختلف پارٹی اقتدار میں آ گئی اور وہ بوڑھا ناظم بن گیا۔ پھر اس کے ساتھ میں چلتا رہا لیکن میں نے پھر چھوڑ دیا اپنے دوست کو۔ اسی طرح دوستی یاری میں بہت دفعہ مار بھی پڑی۔ میرے بازو بھی ٹوٹے، اک دو دفعہ جان بھی خطرے میں پڑی۔ اک دفعہ تو ایسا بھی ہوا کہ ہمارے سندھ کے بہت مشہور رائٹر ہیں، نوجوانوں کے پسندیدہ تو وہ چونکہ دوست تھے ان کو بچاتے بچاتے بھی بہت مار پڑی تھی۔ ایک لڑائی ہو گئی تھی ان کے اپنے آفس میں۔ ایک یونین نے مافیا گروپ بنایا ہوا تھا انکے خلاف، تو ایسے ان کے خلاف پریس ریلیز کروانا۔ میں ڈیلی گاؤں سے لوگوں کو لے کر جاتا، انکے حق میں مظاہرے کرواتا تو یہ سب زندگی میں چلتا ہے دوستی یاری میں۔ پولیس آ گئی تھی، ایف آئی آر کٹی میرے خلاف، میڈیا بھی آ گیا تھا۔ چار گھنٹے لڑتے رہے تھے لیکن ہم نے ان کو اپنے دوست کو ہاتھ تک نہیں لگانے دیا تھا۔

محمد علی کی سماجی مسائل کے حل کے لیے دلچسپی اور لوگوں کی بے لوث مدد کا عکس بچپن سے ہی جھلکتا نظر آتا ہے۔ انھوں نے دس سال کی عمر میں ہی اپنے گاؤں میں منعقدہ کھلی کچہری میں ایک اہم معاشرتی مسئلے کی طرف اشارہ کیا، گاؤں کے اساتذہ سکول میں پیسے لیکر بچوں کو وی سی آر پر فلمیں دکھاتے تھے، محمد علی کے آواز اٹھانے پر پولیس نے کارروائی کی اور معززین علاقہ کی موجودگی میں مسئلہ اپنے انجام کو پہنچا، تشدد سے متعلق واقعات پر وہ کہتے ہیں:

شادی شدہ عورت کی لاش کا ذکر جو میں نے پہلے کیا وہ ہمیشہ میرے ذہن میں رہتی ہے۔ میں عورتوں کو خاص طور پر مظلوم

سمجھتا ہوں۔ معاشرے میں عورتیں جو ہیں وہ ہر حوالے سے پریشان ہیں ہر حوالے سے کمتری کا شکار بنتی ہیں۔

ایک اور اہم واقعہ جس میں مَیں نے اپنی توانائیاں اور وقت لگایا ہے وہ فاطمہ کے ساتھ ہونے والے ظلم کا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم سماجی تنظیموں میں بطور کمیونٹی گروپ کام کر رہے تھے تو وہاں پر ایک خاص گروہ تھا جو کہ عورتوں کے ساتھ کام کر رہا تھا جس میں ہمارے مشترکہ سیشن ہوا کرتے تھے۔ انہی سیشنز کے دوران میری ملاقات ایک لڑکی سے ہوئی جس کا نام فاطمہ تھا۔ وہ بہت پر اعتماد اور عالی حوصلہ لڑکی تھی۔ اس کا تعلق سکھر شہر سے تھا۔ وہ اکثر سیشن میں بتاتی تھی کہ اس کا خاندان بہت سخت اور روایتی ہے۔ اس طرح شہر آ کر کام کرنے میں اسے بہت مشکل پیش آتی ہے۔ ہم اس کی بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ فاطمہ کی وہیں پر کسی لڑکے سے بات چیت ہو گئی۔ انہوں نے آپس میں شادی کرنے کا سوچا اور یہ طے کیا کہ پہلے فاطمہ کے خاندان والوں کو منانے کی کوشش کریں گے۔ اور اگر وہ نہ مانے تو پھر کوئی اور راستہ دیکھیں گے۔ جب فاطمہ نے گھر والوں سے بات کی تو وہ نہ مانے۔ مگر فاطمہ بضد تھی کہ اس نے شادی اپنی مرضی سے کرنی ہے۔ پھر کچھ عرصہ کے لیے فاطمہ کا رابطہ مجھ سے منقطع ہو گیا۔ ایک دن اُس کا فون ہمارے ایک دوست گلزار ملک کو آیا انہوں نے مجھے بتایا کہ فاطمہ ہاسپٹل میں شدید زخمی حالت میں ہے۔ اور لوکل لوگ اسے وہاں لائے ہیں۔ لہٰذہ ہمیں فوراً اسکے پاس پہنچنا چاہیے۔ جب ہم ہاسپٹل پہنچے تو فاطمہ کی حالت بہت خراب تھی۔ ہم نے فوری طور پر اسے ابتدائی طبی امداد دلوائی۔ اس پر بہت بری طرح تشدد ہوا تھا اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ایکسرے کروایا، پولیس کیس تھا لیکن اس نے کہا کہ پولیس کو مت بلاؤ میں بہت چھپ کے نکلی ہوں۔ پتا نہیں کیسے کسی نے میری جان چھڑوائی ہے۔ تو ہم نے کہا نہیں اس کی ایف آئی آر درج ہونی چاہیے تا کہ جو لوگ دباؤ ڈال رہے ہیں وہ فوری طور پر پکڑے جائیں۔ وہ چند لوگوں کو لے کر تھانے گئے اور پولیس والوں کو کہا کہ ایف آئی آر درج کریں لیکن پولیس والوں نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ ہم نے انسانی حقوق کی تنظیم کے ذریعے فاطمہ کو ابتدائی طبی امداد کے بعد کراچی ایک ہاسپٹل میں بھیج دیا۔ اسی دوران محمد علی اور گلزار ملک نے ڈی پی او سے ملاقاتیں کیں اور مظاہرہ بھی کیا تا کہ اس واقعے کی ایف آئی آر درج کرائی جا سکے۔ مگر اس میں بھی یہ مسئلہ تھا کہ اس مقدمے کا مدعی کون بنے۔ پھر پولیس کو انہوں نے مختلف طریقوں سے پریشرائز کروایا۔ آخر کار پولیس نے میرے ہمراہ ایک منشی اور ایک کانسٹیبل کی ٹیم ہاسپٹل بھیجی۔ انہوں نے فاطمہ کے بیان پر ایف آر درج کی۔

فاطمہ نے مجھے اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کے بارے میں بتایا کہ والد کو اس کا باہر نکلنا اور یہ کام کرنا پسند نہیں تھا۔ وہ بہت ناراض تھے اس سے۔ اس کی منگنی بچپن میں ہی اپنے کزن سے ہو گئی تھی جو پولیس میں ہیڈ کانسٹیبل تھا اور داؤد آباد سے تعلق رکھتا تھا، ان دنوں نندا پور میں اس کی تعیناتی تھی۔ تو سکھر کا ایک بہت اثر ورسوخ والا شخص تھا (فرمان شاہ) جو جرگے وغیرہ کراتا تھا اور اس کا تعلق بھی اسکی منگیتر والی کاسٹ سے تھا۔ تو جب فاطمہ نے اپنے گھر والوں سے اجازت لے کر کام کرنے جاتی تھی تو وہ بہت ناراض ہوتے تھے۔

اس کے والدین نے اسکے منگیتر اور اس کے بھائی کو بلایا۔ دونوں پولیس میں تھے اور اکٹھے ہی ایک کوارٹر میں رہ رہے تھے۔ اس کے والد نے کہا کہ یہ ہمارے بس سے باہر ہو گئی ہے بھاگ جائے گی۔ دو چار لفظ پڑھ کے اس کے منہ میں زبان آ گئی ہے اسے خود سنبھالو۔ تم جانو اور یہ جانے۔ تو انہوں نے اپنے وڈیرے کو ساری صورتحال بتائی جو جرگہ کراتا تھا اس سے کہا کہ برادری کی عزت کا معاملہ ہے۔ آپ کچھ کریں ورنہ یہ لڑکی ہماری عزت کو خاک میں ملا دے

گی۔ وڈیرے نے فاطمہ کے والدین اور کزنز کو جرگے میں بلایا مگر فاطمہ نے وہاں آنے سے صاف انکار کر دیا۔ لیکن پھر وڈیرے نے خود فاطمہ کو فون کیا کہ میں تمھارے بھلے کے لیے سوچ رہا ہوں آ جاؤ جو تم کہو گی ویسے ہی کروں گا۔ انہوں نے اک خفیہ میٹنگ کی جس میں فاطمہ کے والدین اور کزنز شامل تھے۔ فاطمہ جیسے ہی وہاں پہنچی تو انہوں نے اسے منانے کی کوشش کی۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ تو جرگے نے اسکے کزن کو کہا یہ کھڑی ہے آپ جیسے مرضی ہے اسے مناؤ اسے ساتھ لے جاؤ اس کے والد کو کوئی اعتراض نہیں۔ اس کو جوتے لگاؤ، یہ میرا فیصلہ ہے۔ پھر انہوں نے اسے دونوں کزنز کے حوالے کر دیا کہ یہ اب تمھارے ساتھ رہے گی چاہے شادی کرو یا جو مرضی کرو۔ یہ آپ دونوں بھائیوں کا مسئلہ ہے۔ تو والد نے بھی کہا کہ ہمیں نہیں چاہیے ایسی بے عزت لڑکی۔ فاطمہ کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ یہ ہوگا۔

اسکے بعد اسکے کزنز نے مل کر اس کے ساتھ جنسی زیادتی کی۔ دو مہینے تک انہوں نے اسے اپنے کوارٹر میں بند رکھا اور روز جسمانی اذیت دیتے، اس کا روز ریپ کرتے۔ وہ اسے باندھ کر مارتے وہ لاش کی طرح پڑی ہوتی۔ اس پر اتنا تشدد کیا گیا تھا کہ اس کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور دو مہینے بعد بھی اس کے زخم مندمل نہ ہوئے۔

گلزار ملک نے کہا نہیں فاطمہ کے ساتھ ہونے والے ظلم کی ایف آئی آر ضرور درج ہونی چاہیے تا کہ جو لوگ فاطمہ پر دباؤ ڈال رہے ہیں وہ پکڑے جا سکیں۔ تو ہم نے مختلف لوگوں سے ملاقاتیں کیں ان کو اس مسئلے کے بارے میں بتایا صحافیوں کو بھی کہا آپ اسے اخباروں میں لائیں تا کہ پولیس اسکو سنجیدگی سے لے اور جو لوگ فاطمہ کو ڈرا دھمکا رہے ہیں وہ بھی باز رہیں۔ پھر وڈیرے کا نام بھی ایف آئی آر میں دے دیا گیا۔ علاقے والوں نے اور وڈیرے نے خود کو بچانے کے لیے منفی طریقے استعمال کرنے شروع کر دیئے۔ ہمیں دھمکیاں دیں، فاطمہ کو بھی دھمکیاں دیں اور اُسکے والدین پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ حتی کہ وڈیرے نے مختلف طریقوں سے براہِ راست بھی ڈرایا دھمکایا مگر میں ان تمام خطرات اور دھمکیوں کے باوجود مسلسل اس معاملے میں فاطمہ کا ساتھ دیتا رہا۔ انہوں نے ہمارے مقامی وڈیروں کے ذریعے بھی دباؤ ڈالا۔ پھر ایک دن مجھے خود وڈیرے نے فون کیا کہ تم بچے ہو میرے بیٹے کی جگہ ہو تم نے ابھی دنیا کو دیکھا نہیں ابھی باز آ جاؤ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ میں نے ان کو کہا کہ ہماری آپ سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ ہم تو حق کے لیے لڑ رہے ہیں اگر آپ نے کچھ نہیں کیا تو آپ ہمارا ساتھ دیں اور یہ کہ اس نے خود پوری دنیا کے سامنے بیان دیا ہے۔ ہم نے زبردستی نہیں دلوایا اور میں اپنے ضمیر کے مطابق جو کر سکتا ہوں کروں گا۔ جتنی مدد کر سکا، کروں گا۔ اس نے کہا ٹھیک ہے اب تم اپنا انجام دیکھ لینا۔ پھر اس نے سارا دھیان فاطمہ کے والدین پر لگا دیا اور ان سے اخبارات میں بیان دلوائے کہ فاطمہ بدکردار لڑکی ہے اس کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے۔ ایک شریف بندے پر جھوٹا الزام لگا رہی ہے ہم اسے عاق کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ پھر یہ ہوا کہ پولیس نے بھی کیس کو کمزور کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پاکستانی قانون کے مطابق آپ کو گواہ درکار ہوتے ہیں تو یہاں پر تو معاملہ ہی الٹا تھا خود ماں باپ نے بیٹی کو ان دو ملزمان کے حوالے کیا تھا جو سب فاطمہ کے قریبی رشتہ دار بھی تھے۔ ڈاکٹرز نے بھی دباؤ کی وجہ سے میڈیکل سرٹیفکیٹ ناقص کر دیا اور مقدمہ گواہوں کی عدم موجودگی اور میڈیکل رپورٹ کی بنیاد پر خارج کر دیا گیا۔ فاطمہ پر اس تمام صورتحال کا بہت زیادہ اثر ہوا وہ بہت پریشان رہنے لگی۔ بیماری اور زخموں کے ساتھ ساتھ اسے ڈیپریشن بھی رہنے لگا۔

تو ہم نے مل کر اس کے لیے بیس ہزار جمع کر کے اسے دیئے کہ اس کا خرچہ چلتا رہے۔ پھر ہم نے اخباروں میں اس

مسئلے کو اٹھایا کہ پولیس نے رشوت لے کر اس مقدمے کو ختم کروا دیا ہے۔ اس نے اپنی کوشش جاری رکھی اور ساتھ ساتھ وہ انصاف کے حصول کے لیے اپیل بھی کرتی رہی۔ اپیل کی وجہ سے وڈیرے نے خود فاطمہ سے رابطہ کیا۔ مختلف حوالوں سے دباؤ بھی ڈالا۔ تب وہ عورتوں کے حقوق پر کام کرنے والے ادارے کے پاس رہ رہی تھی۔ اس کا علاج بھی چل رہا تھا۔ وڈیرے نے اس کو پتا نہیں کیسے صلح پہ راضی کر لیا۔ مجھے ایک دن فاطمہ نے فون کر کے کہا کہ وہ سب آئے تھے میرے پاس صلح کے لیے اور میں نے ان سے صلح کر لی ہے انہوں نے مجھے پچاس ہزار روپے دیئے ہیں اور میں نے ان کو معافی نامہ بھی لکھ دیا ہے انہوں نے کہا ہے کہ جہاں چاہو آپ شادی کر لو۔

تین چار ماہ بعد پہلے وہ ویل چیئر پر پھر تھوڑے عرصے بعد بغیر سہارے کے چلنے لگی۔ اس نے مجھے فون کیا کہ میں اب ٹھیک ہوں چلنے لگی ہوں۔ میں نے انٹر کیا ہے تو میری کہیں نوکری لگوا دیں۔ میری کراچی میں اتنی جان پہچان نہیں تھی تو میں نے مختلف جگہ اپنے ان دوستوں کو کہا جو پہلے بھی اس کیس میں پیش پیش تھے انہوں نے پہلے فاطمہ کے لیے پیسے وغیرہ بھی دیئے تھے۔ ان کی وساطت سے فاطمہ کو ایک انسانی حقوق کے ادارے میں ریسپشنسٹ کی نوکری مل گئی۔ تین چار مہینے تک ہم رابطے میں رہے میں حال چال پوچھ لیتا تھا اس کا، پھر یہ ہوا اچانک رابطہ ختم ہو گیا میں نے سوچا کہ شاید اپنی زندگی میں مگن ہو گئی ہے اس لیے سارے رابطے ختم کر دیئے۔

تھوڑے عرصے بعد مجھے گلزار ملک نے کہا کہ اک بری خبر ہے فاطمہ نے کسی دوسرے بندے سے شادی کر لی تھی آج اس بندے کا فون آیا تھا۔ بتا رہا تھا کہ فاطمہ کی بہن فوت ہو گئی ہے اسے گھر والے شکل نہیں دیکھنے دے رہے اور وہ بالکل پاگل ہو گئی ہے۔ اور یہ کہ اس کے والدین نے صرف منہ بند کروانے کے لیے پیسے دلائے تھے۔ بعد میں مکر گئے اور معافی نامہ بھی واپس لے لیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ کالی ہے۔ ہمارے گھر آئی تو ہم مار دیں گے۔ تو میں نے سکھر میں ڈسٹرکٹ پریس کلب میں اپنے ایک صحافی دوست سے بات کی۔ انہیں صورتحال بتائی کہ فاطمہ کے والدین سے بات کریں۔ بہن کا منہ دکھانے دیں اس کی ماں نے بھی یہی کہا کہ نہیں اس نے ہماری بے عزتی کی ہے۔ ہم نہیں ملنا چاہتے پھر ہم نے فاطمہ کے شوہر کو کہا ہمارا رابطہ نہیں ہوا ان سے تا کہ انہیں مزید اذیت نہ ملے۔ پھر انہوں نے دوبارہ رابطہ ختم کر دیا۔ ہمارے پاس انکا پتا بھی نہیں تھا۔ بس جو آخری بات ہوئی تھی اسکے کے شوہر سے اس نے کہا تھا کہ پوری پاگل ہو چکی ہے۔

اس مسئلے میں مجھے بہت سارے خطرات کا سامنا تھا مگر میں انسانیت کے ناطے جہاں تک ہو سکا فاطمہ کے ساتھ چلتا رہا۔

محمد علی نے اپنی زندگی میں بارہا ایسے خطرات مول لیے جہاں ان کا واسطہ قوی گروہوں اور افراد سے پڑا جن کے لیے کسی کو نقصان پہنچانا معمول کی بات تھی لیکن وہ ناانصافیوں کے خلاف استقامت سے کوششیں کرتے رہے، ایسے حالات میں اپنے اندرونی اور بیرونی دباؤ سے نمٹنے کے حوالے سے وہ کہتے ہیں:

شیخ ریاض کی شاعری، امر جلیل کے افسانے میرے ذہن میں اس طرح سے نقش ہو گئے تھے کہ اللہ جب چاہتا ہے مارتا ہے۔ موت اس کے ہاتھ میں ہے۔ اور میرے بھائی کی کتابیں اور ڈائریاں ان سب نے مجھے کسی قسم کے ممکنہ نتائج کے خوف سے بہت نڈر کر دیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا سب چیزوں کا لیکن میرا خدا پر یقین بہت زیادہ تھا اور یہ سب اس لٹریچر کی وجہ سے جو میں نے پڑھا ہے۔ میں نے اپنے دل میں وہم اور وسوسوں کو ختم کیا ہے۔ انسان کی زندگی میں سب سے بڑی

چیز موت کا ڈر ہے باقی مسئلے تو روزمرہ زندگی کا حصہ ہوتے ہیں۔ اور میرا یہ پختہ ایمان تھا زندگی موت اللہ کے ہاتھ میں ہے کوئی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

میرے ایک دوست ہیں مہر، انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ میرے پاس پریشانیوں سے نجات کا ایک طریقہ ہے۔ انہوں نے کہا جب بھی پریشان ہو جاؤ بس دو الفاظ کا ورد کرو خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ اور وہ دو الفاظ ہیں ''تین دن'' یعنی ہر پریشانی کچھ وقت کی ہے زیادہ سے زیادہ تین دن بعد میں خود ختم ہو جائے گی۔ اس نسخے کو میں نے بار بار دہرایا ہے کہ بس ''تین دن'' آپ یقین کریں کہ میں مطمئن ہو جاتا ہوں تو بس یہی میرا یقین ہے۔ ہمیں موت کو خود پہ حاوی نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں میں بھی پریشان تھا مجھے بھی منہ پہ مارنے کی دھمکیاں مل رہی تھیں۔ گھر سے پریشرائز کیا جاتا تھا، بہنیں، بیوی، بچے۔ میری ماں فوت ہو گئیں۔ اس سے بڑا سانحہ میرے لیے اور کچھ نہیں ہو سکتا لیکن میں آج بھی زندہ ہوں۔ فاطمہ کے کیس میں میرے گھر والوں کو بھی بہت دھمکیاں ملیں، لیکن میں نے ہر چیز کا خندہ پیشانی سے سامنا کیا۔ میرے بھائی دکاندار ہیں والد کی طرح وہ ناراض ہو گئے مجھ سے، گالیاں دی۔ بات چیت بند کر دی انہوں نے، اور میرے سمجھانے کے بعد بھی نہیں مانے۔

دوسرا یہ کرتا ہوں کہ میں اکیلے کمرے میں بند ہو کر لتا کے گانے سنتا ہوں۔ میں بچپن سے لتا کا بہت بڑا فین ہوں۔ بچپن میں بھی میرے پاس ایک ریڈیو ہوتا تھا تو ساری رات میں اسکو سنا کرتا تھا۔ تو اب بھی یہی ہوتا ہے کہ جب میں بہت زیادہ پریشان ہوتا ہوں تو لتا کے گانے سنتا ہوں۔ اگر میں گھر کے مسائل کی وجہ سے بے چین ہو جاؤں یا کسی اپنے کے رویے تنگ کر رہے ہوں تو میں کمرے میں چلا جاتا ہوں گھر والوں کو کہہ دیتا ہوں کہ میں سو رہا ہوں میں خوب روتا ہوں۔ یا پھر میں اپنی ماں کی قبر پر رونے چلا جاتا ہوں، وہاں جا کر اپنی ساری پریشانی ماں کو دے آتا ہوں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے مجھے اپنوں کی یاد بھی بہت ستاتی ہے۔ تب بھی میں رو لیتا ہوں۔ جب وڈیرے نے مجھے مارنے کی دھمکی دی تھی تو میں بہت پریشان تھا کہ میرے گھر بار کا کیا ہوگا۔ ظاہر ہے میں جانتا تھا اسے اور مجھے پتہ تھا کہ وہ مجھے مار دے گا۔ جب میں میوزک سنتا ہوں اداسی خود بخود باہر نکلتی ہے پھر میں نارمل ہو جاتا ہوں۔ لیکن اگر زندگی میں مسئلے نہ ہوں تو زندگی میں سکھ کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

پتہ ہے جب میں نیشنل جیوگرافک یا ڈسکوری میں دیکھتا ہوں کہ کس طرح ایک طاقتور جانور کمزور جانور کا شکار کرتا ہے۔ اور اسی طرح انسان بھی اپنے سے کمزور انسان کا شکار کرتا ہے۔ بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ ہم خود کو بچا لیتے ہیں لیکن بعض دفعہ ہم شکار ہو جاتے ہیں۔ اور ہمارے جیسے معاشرے میں سب سے زیادہ شکار عورتیں ہوتی ہیں اور یہی چیز ہے جو مجھے ہمیشہ احساس دلاتی ہے کہ ان کو بھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے۔

آخر میں میں کہنا چاہوں گا کہ میں آج جو بھی ہوں جہاں بھی ہوں وہ میرے بھائی کی ان کتابوں اور زندگی کے حالات و واقعات جن سے میں گزر کر اس مقام تک پہنچا ہوں سب انہی کی مرہونِ منت ہے۔ میں بھی انسان ہوں میں بھی روتا ہوں، ہنستا ہوں، یہ سب میری اوریئنٹیشن ہے اس تجربہ سے جو مجھے زندگی نے دیا۔

محمد اکرام

گلگت بلتستان کے ایک شہر چیلاس کے قریب دریائے کہار میں سے ایک نوجوان لڑکے کی لاش ملی جسکے سر پر شدید چوٹوں کے نشان واضح تھے جیسے اسکا سر زور سے پتھروں سے ٹکرایا ہو، ابتدائی تحقیق پر معلوم ہوا کہ وہ نویں جماعت کا طالبعلم تھا اور اُسکے چند کلاس فیلوز نے مل کر اسے جنسی تشدد کا نشانہ بنایا تھا جسکے بعد اُس نے دریا میں چھلانگ لگا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا تھا۔ اس علاقے میں تشدد کے ایسے واقعات عام تھے اور ہر وقوعہ کے بعد ماحول پر ایک سکوت طاری ہو جاتا، شاید لوگ اپنی عزت بچانے کی خاطر ان معاملات کو منظر عام پر نہ لاتے اور نہ ہی کوئی قانونی چارہ جوئی کی جاتی تھی۔ محمد اکرام بھی اسی شہر کے ایک باسی ہیں مگر انہیں اس طرح کے مسائل پر خاموش رہنا منظور نہ تھا، وہ اس کیس کو متاثرین کی مدد سے مقامی میڈیا میں لائے، مقدمے کی ایف آئی آر درج کروائی اور شہر میں ایک بڑا مظاہرہ کروایا تاکہ اسطرح کے مسائل پر آگاہی بڑھانے کے ساتھ ساتھ انتظامیہ پر بھی دباؤ ڈالا جا سکے۔

محمد اکرام سے میری ملاقات پہلی بار انکے آبائی گھر میں ہوئی جو نلتر شہر کے نواح میں ایک گاؤں شمشال میں واقع ہے۔ انھوں نے بہت گرم جوشی سے میرا استقبال کیا اور مہمان خانے میں بٹھایا، یہ ہال نما کمرہ روایتی انداز میں سجایا گیا تھا، لکڑی کے ستونوں پر عمدہ کشیدہ کاری کی گئی تھی اور مہمانوں کے لیے قالین اور گاؤ تکیے لگا کر نیچے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ رسمی حال احوال کے بعد اکرام کی زندگی کے حوالے سے ہماری تفصیلی گفتگو شروع ہوئی، انھوں نے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہا:

میرا نام محمد اکرام ہے اور میرا تعلق گلگت بلتستان کے ایک گاؤں شمشال سے ہے۔ جیسے ایک طرف آخر میں کراچی کا ساحل سمندر ہے تو دوسری طرف ہمارا بارڈر ہے جو تاجکستان اور افغانستان کے درمیانی علاقے سے جا ملتا ہے۔ ہمارا گاؤں بالکل آخری سرے پر ہے، یعنی پاکستان کے بارڈر پہ واقع ہے۔

محمد اکرام اپنی خاندانی تاریخ سے گہری وابستگی رکھتے ہیں وہ نہ صرف خاندانی پس منظر سے اچھی طرح واقف ہیں بلکہ انکے رویوں میں بھی اسکی جھلک نظر آتی ہے، انہوں نے فخریہ انداز میں خاندانی فتوحات اور حکومتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا:

میری عمر 39 سال ہے اور میرے خاندان کا شجرہ نصب اس گاؤں کے ساتھ بہت پرانا ہے۔ ہمارا تعلق امیر تیمور کے ساتھ ملتا ہے۔ یہ کوئی 1560 کی بات ہے جب ہمارے بزرگ اس علاقے میں آئے اور یہاں چترال سے لے کر گلگت تک ان کی حکومت شروع ہوئی۔ وہ بہت درویش صفت بندے تھے، انہوں نے ہماری 20 نسلوں تک یہاں حکومت کی۔ ان کے بعد ہمارے پردادا کی حکومت آئی۔ انہوں نے بھی اپنے والد کی طرح بہت اچھی حکومت چلائی۔ میرے پردادا کے چار بیٹے تھے جن میں سب سے بڑے میرے دادا تھے۔ اس لیے رواج کے مطابق انہیں حکومت دی گئی۔ لیکن میرے پردادا نے باقی بیٹوں کو بھی مختلف علاقوں میں حکومت کا موقع دیا جس میں سوات کی مثال ہے جہاں میرے دادا کے چھوٹے بھائیوں کی حکومت رہی ہے۔

چترال میں ایک ایم این اے ہے۔ وہ بھی ہماری فیملی کے لوگ ہیں۔ اس کے بعد "رضا" خاندان ہے، وہ بھی رضائے کے نام سے چترال میں آباد ہیں۔ اور آخر میں " خوش آمد" خاندان ہے۔ تو اس طرح اگر دیکھیں تو میرے باپ دادا اس خطے کے حکمران رہے ہیں۔

لیکن 1972 میں جب بھٹو کی حکومت آئی تو راجگیری نظام ختم کر کے سول ایڈمنسٹریشن لاگو کی گئی اور اس طرح ہمارے دادا اور ان کے رشتے داروں کو انتظامی عہدے دیئے گئے کسی کو ڈی سی (ڈپٹی کمشنر) بنایا گیا، کسی کو ایس پی (سپرنٹینڈنٹ پولیس) بنایا گیا۔

میرے والد چار بھائی ہیں اور ہم بچپن سے ہی مشترکہ خاندانی نظام میں رہ رہے ہیں۔ میرے دادا دادی بھی ہمارے ساتھ اسی گھر میں رہتے ہیں۔ چونکہ میرے والد سب سے بڑے بھائی ہیں تو ان کی شادی بہت جلدی ہوگئی تھی۔

ابتدا میں اپنے خاندان میں واحد بچہ ہونے کے سبب محمد اکرام کو کفالت میں بہت توجہ اور بھرپور پیار ملا جسکے اثرات انکی آنے والی زندگی پر بھی ہوئے وہ سمجھتے ہیں کہ اسی توجہ کے سبب وہ دوسروں کے بارے میں بھی محتاط ہوتے ہیں، انہوں نے بتایا:

میں اپنے گھر میں سب سے بڑا پوتا ہوں اور چونکہ میرے چچاؤں کی شادیاں لیٹ ہوئی اور میرے بہن بھائی بھی مجھ سے کافی چھوٹے ہیں تو میں نے اپنا بچپن بہت مزے میں گزارا۔ کیونکہ میں گھر میں واحد بچہ تھا تو اسی وجہ سے بہت لاڈ پیار سے پالا گیا۔ مجھے والدین اور گھر والوں کی طرف سے ایکسٹرا توجہ دی گئی۔ مجھے یاد ہے جب تک میں سکول گیا تو تب تک ہمارے گھر میں کوئی بچہ نہیں تھا۔ اگر زیادہ ہوتے تو شاید مجھے اس طرح کی توجہ نہیں ملتی۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ جب میں سکول گیا تو ہمیشہ اپنے دوستوں کو تحفظ دینے کی کوشش کی مطلب میں نے ان کا دھیان رکھا۔

ایک وضاحت میں یہاں پر کر دوں کہ ہم چار بھائی اور دو بہنیں ہیں، میرے باقی بھائی، بہن مجھ سے عمر میں کافی چھوٹے ہیں۔ چونکہ نلتر پاکستان کے پسماندہ علاقوں میں آتا ہے تو وہاں پر 1940 میں آغا خان سروس کے تحت سکول بنائے گئے تھے جو کہ مدرسوں میں ہوتے تھے۔ تو میں نے بھی ابتدائی تعلیم وہاں سے حاصل کی۔ پھر مڈل میں مَیں سرکاری سکول میں چلا گیا۔

سکول میں تشدد کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے اکرام نے لڑکوں کا ایک دوسرے پر جنسی تشدد اور اُستاد کی طرف سے جسمانی اور نفسیاتی تشدد بیان کیا، اکرام نے ان واقعات پر ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے ہم خیال دوستوں کے ساتھ ملکر متاثرہ لڑکوں کو تحفظ بھی فراہم کیا تھا، وہ کہتے ہیں:

اگر میں اپنے بچپن کو یاد کروں تو مجھے آج بھی یاد ہے کہ اس ٹائم میں بھی جو چھوٹے بچے ہوتے تھے یا جو خوبصورت لڑکے ہوتے تھے ان کے ساتھ بڑے لڑکے جنسی ہراسانی کرتے تھے۔ مجھے اس دور میں بھی پتا تھا کہ ہمارے سکول میں یہ ہوتا ہے۔ تو ہم اس ٹائم پر بھی اپنے لیول پہ کوشش کرتے تھے کہ اپنے دوستوں کی حفاظت کریں اور اس مقصد کے لیے ہم کوشش کرتے تھے کہ ان کو اپنے ساتھ بٹھائیں، بریک میں ان کے ساتھ رہیں۔ میں چونکہ مانیٹر تھا تو مجھے بڑا شوق ہوتا تھا دوسروں کی مدد کرنے کا چھوٹے چھوٹے کام کر کے

بہت خوشی ہوتی تھی۔ چونکہ اس ٹائم ہم یہاں بات کسی فورم پر نہیں اٹھا سکتے تھے تو میں نے یہ کیا کہ اپنے ہم خیال دوستوں کا گروپ بنایا جو کہ چھوٹے لڑکوں کی حفاظت کرنے کی کوشش کرتے۔

پھر مڈل اور ہائی کرنے کے لیے میں نلتر آیا، وہاں ماڈل سکول نمبر ون ہے نلتر کا بہت اچھا سکول ہوا کرتا تھا، میں نے اس میں داخلہ لیا تھا۔ وہاں پر یہ رجحان بہت زیادہ تھا۔ خاص طور پر اس وقت لڑکوں کو، خوبصورت لڑکوں کے ساتھ تصویریں کھنچوانے کا بہت شوق ہوتا تھا۔ شروع میں جب میں یہاں آیا تو ہمارے ماموں زرعی ترقیاتی بینک میں منیجر تھے تو میں ایک سال ان کے ساتھ رہا اس کے بعد ان کی ٹرانسفر غزر ہوگئی تو پھر مجھے ہاسٹل میں داخلہ لینا پڑا، ہم چونکہ ہاسٹل میں رہ رہے تھے تو ہم نے کوشش کی کہ اپنے علاقے کے چھوٹے اور کمزور لڑکوں کو ساتھ رکھیں۔

اکرام جنسی تشدد میں ملوث بڑی عمر کے لڑکوں کے بارے میں گہرا مشاہدہ رکھتے تھے اُن طریقوں پر بات کرتے ہیں جو چھوٹے لڑکوں کو راغب کرنے کے لیے آزمائے جاتے تھے:

بڑا دلچسپ طریقہ تھا ان لوگوں کا، لڑکوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے پہلے تو وہ آہستہ آہستہ میل جول بڑھاتے، پھر مالی فوائد دے کر کوشش کرتے۔ کئی دفعہ یہ بھی ہوا کہ ہم نے گروپ کی صورت میں ان کے بنے بنائے منصوبے ناکام بنا دیے۔ لیکن ابھی بھی نلتر میں یہ چیزیں بہت زیادہ ہیں۔

ماضی کو دیکھتے ہوئے اس خصوصی مسئلے کے حل کے حوالے سے وہ غیر مطمئن ہیں اور کہتے ہیں یہ چیز اب بھی عام ہے، وجوہات پر نظر ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا:

کوئی ان مسائل پر آواز نہیں اٹھانا چاہتا، کیونکہ لوگوں کو لگتا ہے کہ اس سے مزید عزت خراب ہو جائے گی۔ اور یہ چیز وقت کے ساتھ ساتھ بہت عام ہوتی جا رہی ہے۔ سب کو پتہ ہے کہ یہاں ایسے لوگ ہیں جو زیادہ تر پیسے دے کر یہ کام کرتے ہیں۔ ظاہری بات ہے، والدین غریب ہیں اور وہ تو بچوں کا صرف پڑھائی کا خرچہ برداشت کر سکتے ہیں تو اس طرح کے لوگ بچوں کو ورغلا کے ان کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ میٹرک کے درمیان بھی میں نے بہت سی سوشل سرگرمیوں میں حصہ لیا۔

ہمارے ساتھ ایک لڑکا تھا وہ بڑا خوبصورت تھا۔ ابھی ماشاءاللہ وہ بڑی سینیئر پوزیشن پر ہے، اس کو کچھ لڑکے بہلا پھسلا کر ساتھ لے گئے۔ وہ اغوا ہو گیا تو پھر دو دن بعد ملا۔ اس کے خلاف ہم نے احتجاجی سلسلہ چلایا تو پھر نتیجتاً ہمارے سینیئر نے کہا کہ اگر اس کو مزید اچھا لو گے تو مزید اس بندے کی عزت خراب ہو جائے گی پہلے دو بندوں کو پتہ چلا ابھی تو ہزاروں کو پتا چلے گا تو اس کے بجائے یہ کریں کہ اس بندے کو اپنے ساتھ رکھیں تا کہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو۔

اکرام کمزور لڑکوں کو تحفظ فراہم کرنے کے عمل کو اپنے خاندانی پس منظر سے ملاتے ہوئے کہتے ہیں:

اس طرح ایک تھوڑا سا مجھے فائدہ یہ تھا کہ میرا حکمران فیملی سے تعلق ہونے کی وجہ سے ہمارا احترام ہوتا تھا کہ یہ راجہ ہے تو وہ تھوڑا سا خاندانی برتری کی وجہ سے بھی میں ایک لیڈنگ پوزیشن میں ہوتا تھا۔ ہماری یہ کوشش ہوتی تھی کہ علاقے کے جتنے بھی لڑکے ہیں جو ادھر ادھر سے پردیس آئیں ہیں تو ہم پہلے ان سے ملیں۔ پھر ہماری

آپس میں واقفیت بڑھتی تھی پھر ہم ایک جگہ پہ بیٹھتے تھے ڈسکس کرتے تھے۔ ہم ان کو سمجھاتے تھے کہ یہ شہر ہے اور یہاں اچھے برے ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہاں آپ کو مسئلے آئیں گے تو آپ نے ان سے کیسے نمٹنا ہے۔

اکرام کا تاریخ سے لگاؤ بھی بچپن سے ہی نظر آتا ہے، انھوں نے فخریہ انداز میں بتایا:

یہ 1989 کی بات ہے، میں نے علاقائی تاریخ پر ایک آرٹیکل بھی لکھا جو بعد میں اخبار میں چھپا اور ایک کتاب کے ریفرنس میں بھی آیا۔

پھر ایف ایس سی کرنے کے لیے میں کراچی چلا گیا وہاں پر میرے اک چاچا اور کچھ کزنز تھے، ہم سب ایک ساتھ فلیٹ میں رہتے تھے۔ سب لوگ وہاں جاب بھی کرتے تھے اور ساتھ پڑھتے بھی تھے۔ اس لیے کہتے ہیں کراچی تو غریبوں کا شہر ہے میں نے پڑھا بھی اور ساتھ کام بھی کیا میرے چاچا بھی پہلے وہاں پڑھتے تھے۔ میرے ایک کزن وہاں سے ایف ایس سی کر کے ڈاکٹر بننے کے لیے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج گئے۔ پھر روایت کو برقرار رکھتے ہوئے میں بھی سیدھا کراچی چلا گیا۔ ویسے میرا شروع سے انٹرسٹ تھا کہ میں انجینئر بنوں لیکن گھر والوں نے کہا کہ نہیں پری میڈیکل میں داخلہ لو۔ تو میں نے داخلہ لے لیا لیکن میری سیٹ نہیں آئی تھی میڈیکل کی۔ گھر والوں کی بہت خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں کیونکہ اس زمانے میں لوگوں کو زیادہ کچھ پتہ نہیں تھا بس میڈیکل یا انجینئرنگ کا پتہ ہوتا تھا، میرے گھر والوں کو بھی نہیں پتہ تھا کہ اور فیلڈ بھی ہو سکتے ہیں۔ وہاں پہ بھی حسب معمول سوشل سرگرمیاں جاری رکھی، ہماری مقامی سٹوڈنٹ تنظیمات ہوتی تھی۔ جن میں سے ایک متوسط سٹوڈنٹ فیڈریشن تھی اس کے ساتھ میں نے تھوڑا سا کام بھی کیا۔ ہم یہ کرتے تھے کہ جو بھی ہمارے سٹوڈنٹس آتے تھے ایڈمیشن لینے ہم ان کی مدد کرتے تھے۔ کوئی پرائیویٹ امتحان کے لیے ہمیں فارم بھیجتا تو ہم جمع کرا دیتے تھے، اسی طرح چھوٹی موٹی مدد کرتے۔ اس وقت حالات خراب تھے، نسلی لسانی چیزوں کی وجہ سے قتل دہشت گردی جاری تھی۔ وہاں اک لیاقت میموریل لائبریری تھی کراچی میں، ہم سب دوست پڑھنے کے لیے وہاں جاتے تھے۔ وہاں بیٹھ کے پڑھتے تھے۔ پھر میں لاہور چلا گیا تھا سائنس کو چھوڑ کہ آرٹس کی طرف۔ میں نے بی کام میں اپنے ایک کزن کے کہنے پر ایڈمیشن لیا لاہور میں۔ تو وہاں پر سوشل ورک کے جراثیم جو مجھ میں تھے، وہ تھوڑا زیادہ متحرک ہو گئے۔ میں شمالی علاقہ جات سٹوڈنٹس فیڈریشن جو پہلے سے وہاں موجود تھی، اُسکا ممبر بنا اور پھر کچھ عرصہ بعد اس کا چیئرمین بنا، اس وقت پنجاب یونیورسٹی میں جو اسٹوڈنٹس ایڈمیشن کے لیے آتے تھے اور انہیں کافی مسائل تھے، میں نے ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی۔ وہاں ہمارا کوٹہ تھا، گلگت بلتستان کے سیدھے سادے لوگ ہوتے ہیں تو وہ تحفے تحائف دیتے تھے اور اپنے کام نکلواتے تھے، ایک دفعہ ہمارے دوست کا ایڈمیشن نہیں ہو رہا تھا، سٹاف کے بندے نے کہا یہ لیٹ ہو گیا ہے، میں اس کے ساتھ تھا میں نے کہا ہم وی سی کے پاس جائیں گے اس نے کہا جس کے بھی پاس جاؤ اب لیٹ ہے۔ اصل میں وہ اس کوشش میں تھا کہ مجھے بھی تحفے میں کچھ مل جائے۔ ان دنوں گورنر ہاؤس میں ہمارا ایک بندہ ہوتا تھا تو میں نے اس سے کہا کہ گورنر سے ملاقات کا کیا طریقہ کار ہے۔ تو اس نے کہا کہ آپ کوئی وفد بنا کے ٹائم لے

سکتے ہیں وہ ایک ہفتے میں ٹائم دے دیں گے۔ یہ 93-92 کی بات ہے اس وقت مرحوم الطاف پنجاب کے گورنر ہوتے تھے۔ بڑا اچھا بندا تھا اس وقت کنگ ایڈورڈ کالج میں بھی ہماری سیٹیں ختم کی گئی تھی اور پنجاب یونیورسٹی میں بھی ایڈمیشن کا مسئلہ تھا۔ گورنر صاحب سے میں نے ڈسکس کیا۔ کہ یہ ہمارا کوٹہ سسٹم ہے۔ تو اس نے کہا کہ میڈیکل کالج وفاق کے ساتھ ہے تو یہ وہ حل کریں گے اور پنجاب یونیورسٹی کا اس نے فوری طور پر احکامات جاری کیے ہمارے سیٹوں کی بحالی کے، میں تو ایک دوست کے لیے کر رہا تھا سب، میں جب رجسٹرار کے پاس گیا تو اس نے کہا سر جی آپ کے سارے لڑکوں کے ایڈمیشن ڈیپارٹمنٹ کو بھجوا دیے ہیں، اس طرح چھ سیٹیں میں نے بحال کروا دیں، گورنر سے اس وقت ملنا دل گردے کا کام ہوتا تھا پھر ہمیں پی ٹی وی پہ اچھا خاصا کوریج بھی ملا۔ ہم نے وہاں نئے اسٹوڈنٹس کو ویلکم پارٹی اور جانے والے سٹوڈنٹس کو فیئر ویل دینا شروع کی اسی طرح فری کو چنگ کلاسز سٹارٹ کیں۔

یونیورسٹی میں سیاسی سرگرمیوں کے حوالے سے بات کرتے ہوئے اکرام نے کہا:

وہاں جمعیت کا مکمل ہولڈ تھا لیکن ہمارا کبھی ان کے ساتھ لڑائی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ اس دور میں یونین سازی پہ تو پابندی تھی لیکن فارمل اسٹوڈنٹس تنظیمیں تھیں پنجاب یونیورسٹی میں۔ کہیں لڑکا اور لڑکی ساتھ بیٹھے ہوتے تو جمعیت والے تنگ کرتے خاص طور پر جو کمزور شریف سے لڑکے ہوتے تھے تو ان کو ڈراتے تھے ہمارے ساتھ اکثر علاقے کی لڑکیاں ہوتی تھیں۔ تو کبھی جماعت نے نہیں کہا کہ مت کرو کیونکہ ان کے اپنے ناظمیں لڑکیوں کو ساتھ لے کے جاتے تھے۔ ان کو اسلام نے پابند نہیں کیا لیکن جو دوسرا کرتا ہے تو اس کے لیے پابندی ہے، ہم اکثر ان کے ساتھ مذاق بھی اڑاتے تھے۔ ہم کہتے تھے کہ اسلام تو ایک ہی راستہ ہے۔ یا تو سب کے لیے ٹھیک ہے یا سب کے لیے غلط ہے۔ آپ ساتھ لے کے گھومو تو آپ کے لیے ٹھیک ہے تو جو بیچارہ شریف آدمی ہے اس کے لیے غلط ہے۔

پھر یہ ہے کہ میں گریجویشن کے بعد واپس ملتان آیا اور وہاں پولیٹیکل سائنس میں ماسٹر پرائیویٹ طور پر پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔ 96 میں مکمل طور پر فارغ ہو گیا تھا پڑھائی سے۔

پڑھائی مکمل کر لینے کے بعد اکرام کو اپنے علاقے میں مختلف قسم کے روایتی دباؤ کا سامنا کرنا پڑا جو کہ انکی ذاتی زندگی سے متعلق تھے، وہ بتاتے ہیں کہ:

پڑھائی کے بعد جب یہاں آیا تو کچھ اداروں سے مجھے پیشکش ہوئی انہوں نے بتایا کہ ہمارے پاس کچھ پوزیشنز ہیں آپ ہمارے پاس کام کریں تو میں نے کہا کہ نہیں میرا ابھی فی الحال جاب کا ارادہ نہیں ہے۔ پھر مختلف سوشل کام ایسے ہی ذاتی طور پر میں کرتا رہا۔ اسی دوران لوگوں سے میل جول بڑھا۔ دوستوں سے ملا کیونکہ ہمارے علاقے کی روایت تھی کہ بس نوکری کرنی ہے، تو میں نے اس روایت کو تھوڑا سا توڑا۔ اس وقت گھر سے پریشر تھا کہ میں فی الفور نوکری کیلئے کوئی بندوبست کروں۔ مجھے صرف ایک فائدہ یہ تھا کہ گھر میں کوئی خرچہ ورچہ دینے کی مجبوری نہیں تھی والد صاحب خود موجود تھے۔ عام والدین کیطرح میرے والدین کی بھی خواہش تھی کہ نوکری کروں۔ ان کو بھی میں نے کہا بس ٹھیک ہے ایسا کچھ کروں گا کہ انکم کہیں نا کہیں سے آ جائے گی۔ لیکن نوکری نہیں کروں گا۔ تو بہر حال گھر والوں کو میں نے منوا لیا۔

اکرام نے اپنے ابتدائی سماجی کام کے حوالے سے بتایا:

میں نے سروے کے بعد لوگوں کو جمع کیا۔ جس میں پورے گاؤں کے اہم افراد خصوصاً اساتذہ شامل تھے کو اکٹھا کیا اور انہیں سمجھایا کہ ابھی ہم اپنی سطح پہ مل کر کام کریں گے اور بعد میں دوسرے لوگوں کو بھی شامل کریں گے اور اسطرح ہم نے اپنی آرگنائزیشن (ویلفیئر گروم) کی بنیاد ڈالی۔ اپنا سسٹم بنایا لوگ تو اس وقت کہتے تھے بس یہ پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے۔ جب آہستہ آہستہ میں نے سرگرمیاں شروع کیں اور کچھ کامیابیاں ملیں تو لوگوں کو پتہ چلا کہ ہم نے جو کیا وہ علاقے کے فائدے کے لیے ہے، ہمیں ۱۰ سال لگ گئے لوگوں کو یہ یقین دلانے میں۔ تو شروع شروع میں ہم نے گاؤں میں چھوٹی سی لائبریری بنائی تھی سب سے پہلے وہاں ٹیچرز لیے۔ اور خواتین کے لیے دستکاری اور کچھ مشینیں لے کر کڑھائی سلائی سے کام کا آغاز کیا تھا۔ پھر میں نے، ہمارے گاؤں میں جتنے بھی پڑھے لوگ ہیں سب سے کہا کہ ہم گاؤں میں جائیں گے جن کے پاس جو جو کتابیں ہیں جمع کریں گے۔ ابتدائی طور جو کتابیں ہمارے پاس تھیں ہم سب نے اپنی اپنی کتابیں دے دیں۔ پھر شیخ فاؤنڈیشن اور ایشیا فاؤنڈیشن سے کتابیں جمع کیں، اب ہم ایشیا فاؤنڈیشن کے باقاعدہ ممبر ہیں اور میں وہاں سے کتابیں لاتا ہوں۔ اس طرح ہم سب نے ایک ماحول بنایا لوگوں کے لیے۔ علم مہیا کرنے کے لیے۔ چونکہ ہمارا علاقہ یک فصلی ہے تو سردیوں میں کوئی فصل کاشت نہیں ہوتی ہے اور اکثر لوگ فارغ ہوتے ہیں۔ مختلف جگہوں پر لوگ کوئی لڈو گیم کھیلتے تھے کوئی تاش کھیلتے تھے تو سب فضول کاموں میں لگ جاتے تھے۔ لیکن اب وہاں پڑھنے کا رجحان بڑھا ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ لائبریری کو ابھی تک کوئی باقاعدہ مالی امداد نہیں ملی تو ہم اس کو اپنی مدد آپ پر چلا رہے ہیں۔ یہ بتاتے ہوئے خوشی محسوس کروں گا کہ آغا خان یونیورسٹی کی ایک برانچ ہے وہاں سے سالانہ ایم ایڈ کرواتے ہیں، ہم نے چونکہ انٹرنیشنل معیار کی اچھی اچھی کتابیں رکھیں ہیں منیجمنٹ اور ایجوکیشنل سائیکالوجی کے حوالے سے تو سالانہ سب سے زیادہ ہمارے گاؤں کے لوگ ایم ایڈ اور بی ایڈ کرنے کے لیے کامیاب ہوتے ہیں اور ابھی بھی دو تین بندے جو ہیں اس لائبریری کی وجہ سے پی ایچ ڈیز ہیں۔

اسی طرح عورتوں میں تکنیکی مہارتوں کے لیے حکومت سے ملکر ہم نے مختلف سنٹر قائم کیے ہیں جہاں خام مال پر کام کر کے اسکو مہنگے داموں مارکیٹ میں فروخت کیا جاتا ہے اور اسطرح عورتوں کی آمدن بڑھتی ہے، میرے خیال میں اگر ایک خاتون مجبور ہے اور غریب ہے میں اس کو یہ کہوں کہ تمہارا حق ہے کہ مرد سے یہ لے لو۔ اب مرد بھی غریب ہے اور اسے کچھ نہیں دے سکتا تو میں اس کی بجائے کوئی مہارت سکھا کر اسکو آمدن بڑھانے کی طرف لے جاؤنگا تو وہ خود بخود اپنے حالات تبدیل کرے گی۔

شروع سے ہی میرے دو نقطہ نظر ہیں ایک تو سماجی شعبے کے حوالے سے ہے کہ واقعی آپ قوم کی بہتری کے لیے کچھ حصہ ڈال رہے ہوتے ہیں اور آپ سوسائٹی کو تبدیل کر رہے ہوتے ہیں۔ چاہے کسی انداز میں ہو، اور دوسرا جو میں نے کہا تھا کہ میٹرک سے ہی تھوڑا سا کچھ لکھنے پڑھنے کا شوق تھا کہ اخبارات میں آرٹیکلز لکھنا وغیرہ اس لیے مسائل پر بات کرنا اسی وقت سے میری عادت تھی۔

اکرام سماجی خدمات میں چند نامی گرامی شخصیات سے متاثر ہیں اور انکی مثالیں پیش کر کے انکی پیروی

کرتے نظر آتے ہیں، انھوں نے بتایا:

میرا ماننا یہ ہے کہ انسان کے بس میں جتنا ہو کرے۔ کیوں کہ لوگ آپ کو آپ کے کام سے یاد رکھتے ہیں مثال کے طور پر عمر اصغر خان جو آج زندہ نہیں ہیں۔ انہیں سنگی فاؤنڈیشن کی وجہ سے آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ورنہ عمر اصغر خان جیسے کتنے لوگ مرے ہیں، بہت اعلیٰ پروفیسرز بہت اچھے اچھے لوگ بھی گئے ہیں لیکن اچھے ادارے کی بنیاد ڈالی تو آج بھی زندہ ہیں۔ لوگ ان کو اچھے الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔ یہی میری بھی عادت ہے کہ میں ابھی بھی آرٹیکلز لکھتا ہوں۔ میرے آرٹیکلز کتابوں میں بھی آتے ہیں میں مسائل پر بات کرتا ہوں، کوشش کرتا ہوں انہیں حل کرانے کی۔

اکرام اپنے خاندانی پس منظر کی بنا پر مقامی سطح پر مختلف معاملات (خاندانی جھگڑے، زمین کے تنازعے وغیرہ) میں لوگوں کی صلح اور دیگر مدد بھی فراہم کرتے ہیں:

ایک دفعہ محبت کی شادی کا ایک کیس ہوا۔ لڑکا اور لڑکی شادی کی غرض سے بھاگ گئے تھے تو مقامی لوگوں نے ان کو پکڑا اور مار پیٹ کے پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ مجھے پتا چلا تو میں فوراً تھانے پہنچا۔ تھانے والے ان کو میڈیکل کروانے کے لیے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال لے گئے تھے۔ رات تک ہم بیٹھے تو وہ واپس نہیں آئے، ڈسٹرکٹ ہسپتال چونکہ شمشال سے دور ہے۔ میں جب وہاں پہنچا تو وہ پولیس والے میڈیکل کرا کے نکل رہے تھے، میں بھی ان کے ساتھ عدالت چلا گیا۔ عدالت میں جب جج صاحب نے کہا آپ اس کی ضمانت دے دیں تین لاکھ کی، اگر آپ اس کو تحفظ دے سکتے ہیں۔ تو میں نے دستخط کر کے دے دیئے۔ اور فوراً خاتون کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی اور پھر عدالت کے ذریعے کچھ دن بعد ان کا نکاح کروا دیا۔ اگر میں اس وقت خاتون کو تحویل میں نہ لیتا تو وہ پولیس کے ہاتھ چلی جاتی اور پھر شاید وہ لڑکا اس سے شادی کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا۔ چونکہ ہمارے پولیس اور اس کا سسٹم سب کے سامنے ہے۔ اس خاتون کو ڈیڑھ مہینہ میں نے پناہ دی تھی۔ ڈیڑھ مہینے تک میں نے کوشش کی کہ ان کے والدین سے بات کروں مگر وہ نہیں مانے۔ علاقے کے لوگوں کے ساتھ بھی بات کی تو انہوں نے کہا کہ بہترین حل یہی ہے کہ اس کا نکاح کیا جائے۔ کیونکہ اپنی مرضی سے گئے ہیں اور ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ تو اس طرح ہم نے فوراً ان کو مدد دی۔

اکرام معاملات کو عدالت سے باہر فریقین کی رضامندی سے حل کرنے کے حامی نظر آتے ہیں، انکے تجربات کی روشنی میں عدالت میں جانے سے معاملات مزید بگڑ جاتے ہیں، انھوں نے بتایا:

زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ تھانے میں کیسز جاتے ہیں تو مجھ سے کوئی نہ کوئی رابطہ کرتا ہے۔ یا ذاتی طور پر مجھے پتا چلے تو میں وہاں جاتا ہوں۔ میں کیس واپس نکالتا ہوں۔ ایف آئی آر ہونے سے پہلے، اگر ایف آئی آر ہو جائے تو پھر عدالت جا کے نکلوانا ہوتا ہے۔ ہم فریقین کے ساتھ صلاح مشورہ کرتے ہیں۔ وہ صلح نامہ لا کے جمع کراتے ہیں تو مصلحت ہوتی ہے تو خود بخود وہ کیس ختم ہو جاتا ہے۔ آپ کو پتا ہے اس دور میں ایک کیس عدالت میں چلا جائے تو ایک تو آپ کے مالی وسائل کا ضیاع ہوتا ہے۔ آپ کا ٹائم برباد ہوتا ہے تیسری بات یہ ہوتی ہے کہ دو فریقوں کی آپس میں دشمنیاں چلتی رہتی ہیں۔ اسی لیے میری یہ رائے ہے کہ آپ اگر مصالحت کراتے ہیں تو آپ تین چیزوں سے بچ جاتے ہیں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ تر کیسز کو ہم

عدالت تک نہ لے جائیں۔

اپنی مزید سماجی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے طلاق کے ایک کیس کا ذکر کیا جس میں جہیز کے سامان کا تنازعہ حل کیا گیا، دو بھائیوں میں زمین کی منصفانہ تقسیم کا مسئلہ باہمی رضامندی سے طے کیا گیا، کچھ مسائل کی نشاندہی انہوں نے یوں کی:

ایک اور مسئلہ جس پر میں نے کام کیا وہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ نہ صرف ہمارے علاقے میں بلکہ پورے پاکستان میں خودکشی کا ریشو بڑھ رہا ہے، ہمارے ہاں عورتوں میں یہ ریشو خاص طور پر بڑھ رہا ہے۔ اس کی بنیادی وجوہات میں جنریشنل گیپ ہے۔ آپ ایک گھر میں ہیں وہاں دادا، دادی، باپ بھی ہے ہمارے عمر کے نوجوان بھی ہیں۔ جیسے میں نے آپ کو سکول کا ذکر کیا۔ میری زندگی میں ہی سکول میں بہت تشدد تھا، اب والد کا، دادا، دادی کا وہی ذہن ہے، سکول کے استاد والا جو بچوں کو لاتیں مارتا تھا۔ کیونکہ ان کی تربیت ایسے ہی ہوئی ہے اگر بچے نہ مانیں یا اپنی مرضی کریں تو وہ مارتے ہیں کہ یہ آزاد ہے، بدتمیز ہے اسے مارو۔ خود سوچیں کہ ساتویں، آٹھویں یا نویں کلاس کے بچوں کی کیا سمجھ بوجھ ہوسکتی ہے بس جا کے دریا میں چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ اپریل سے ابھی تک کوئی اسی کیسز ہوئے ہیں یہاں۔ شادی شدہ کو کہا جاتا ہے کچھ بھی ہو وہیں رہو، پھر اس کے پاس تو خودکشی کرنے کے علاوہ کوئی آپشن نہیں ہے، جائے گی کہاں؟

اکرام ایک لیڈر کو خدمتگار کے طور پر بیان کرتے ہیں، انکے خیال میں ایک اچھا خدمتگار ہی اچھا لیڈر بن سکتا ہے، وہ بیت المال کے چیئرمین بھی رہ چکے ہیں، سماجی خدمات کے حوالے سے وہ کہتے ہیں:

ایک واقعہ جو میری زندگی میں کافی اہمیت کا حامل ہے اور جس پہ میں نے بہت آواز بھی اٹھائی۔ ہمارے علاقے میں لڑکوں کا لڑکوں کے ساتھ جنسی میل جول بہت زیادہ ہے یہ بھی اسی نوعیت کا واقعہ ہے۔ نویں کلاس کا بچہ تھا اسمٰعیل، یہاں ہمارے علاقے میں تو اس کے دو کلاس فیلو بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی کرتے تھے تو انہوں نے کافی دفعہ اسمٰعیل کو بھی پیشکش کی اور ساتھ لے جانے کی کوشش کی۔ پیسوں کے لالچ یا دباؤ کے ذریعے بڑے لڑکوں کا یہ کام ہوتا تھا۔ اسمٰعیل کو جب پتہ چلا کہ ان کی سرگرمیاں ٹھیک نہیں اور ایسے لوگوں میں انکا اٹھنا بیٹھنا ہے۔ تو اسمٰعیل نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ کہ یہ غلط کام ہے یا اسے چھوڑ دو تو انہوں نے اپنے گینگ میں جا کر اس کا ذکر کیا۔ گینگ کے دوسرے لوگوں نے ایک دن پلان بنا کر اسماعیل کیساتھ جنسی تشدد کا منصوبہ بنایا۔ چونکہ ہمارے سامنے نہیں ہوا تو کچھ لوگ بتاتے ہیں کہ ایک دن وہ بچے اسماعیل کو بہلا پھسلا کے زور زبردستی سے ساتھ لے گئے اور اس کے ساتھ وہاں گینگ ریپ کیا۔ وہاں میرا بیٹا بھی ہوگا تو ظاہری بات ہے افسوس ہوگا۔ تو اس بچے نے واپس آ کر خودکشی کر لی، اس نے دریا میں چھلانگ لگائی تھی۔ وہ لڑکا وہیں مر گیا تھا تھوڑے عرصے بعد اس کی لاش بھی مل گئی تھی۔ پھر یہ ہوا کہ کسی نے اس کیس کو نہیں اٹھایا کیونکہ وہی عزت والی بات آ جاتی ہے۔ لیکن میں واحد بندہ تھا۔ جس نے نہ صرف کیس کو اٹھایا۔ بلکہ ان لوگوں کے خلاف ایف آئی آر بھی درج کرائی۔ میں نے اس کو اخباروں میں دیا۔ اس کے علاوہ ہم نے باقی میڈیا میں اٹھایا، اس کیس کو لے کر پھر ہم نے ملتر کی تاریخ کا سب سے بڑا مظاہرہ بھی کروایا۔ چونکہ اس گینگ کو مسلم لیگ (ن) کی حمایت حاصل تھی وہ ان کے سپورٹرز تھے تو کافی پریشر تھا ہم نے بھی مختلف سیاسی بندوں کو

استعمال کیا۔ ان کے بیان دلوائے اخباروں میں پھر جا کے وہ بندہ جس نے زیادتی کی تھی گرفتار ہوا تھا۔ پھر پورا ٹرائل چلا تھا اس بندے کے خلاف، لیکن انہیں سپورٹ حاصل تھی اور یہ بھی تھا کہ آئے دن میرے ورکرز اور ساتھیوں کو دھمکیاں ملتی ان کو پریشرائز کیا جاتا۔ ڈارنا، دھمکانا۔ میں چونکہ معروف فیملی کا بندہ تھا مجھ پہ پریشر بہت کم تھا، لیکن باقیوں پہ بہت تھا۔ لیکن اک جو مثبت چیز تھی ہمارے ساتھ وہ لوگوں کی مدد تھی۔ مقامی لوگوں نے ہمارا بہت ساتھ دیا تھا، احتجاج میں بھی اور کیس کو اُٹھانے میں بھی۔ مجھے ایک دو کال آئی تھی کہ آپ کہاں ہیں۔ گلگت آئے تو ہم آپ کو بتائیں گے لیکن اس ٹائم میں نے اس کو سنجیدہ نہیں لیا تھا۔ لیکن ظاہری بات ہے میں بھی انسان ہوں مجھے بھی پریشانی ہوتی ہے تو میں نے تھوڑی احتیاط کی اس ٹائم پر۔ چونکہ ہمارے پاس تو روز ایسے کیسز آتے ہیں جہاں جان کو خطرہ ہوتا ہے۔ تو ہمیں بھی ڈر لگتا ہے۔

اکرام جب اسطرح کے مشکل کیسز میں شامل ہوتے ہیں تو انکو کچھ چیزیں حوصلہ بھی دیتی ہیں، انھوں نے بتایا:

یہ سب اگر میں دیکھوں تو ہمارا دین ہمیں اس چیز کا سبق دیتا ہے کہ جہاں ظلم دیکھو اس پہ آواز اٹھاؤ۔ رسول پاک کی حدیث بھی ہے اگر کوئی برائی آئے تو اس کو آپ روکنے کی کوشش کرو۔ اگر آپ اس کو مکمل نہیں روک سکتے تو اس کو برا سمجھو۔ یہ بھی نہیں کر سکتے تو کمزور ترین ایمان کی علامت یہ ہے کہ دل میں کہو کہ یہ بُرا ہے۔ چونکہ اسلامی فلسفہ یہ ہے اور معاشرے کے ذمہ دار شہری ہونے کی حیثیت سے بھی اور کچھ اسلامی تعلیمات پڑھنے کے بعد انسان میں یہ چیزیں آ جاتی ہیں کہ اپنے لیے تو سب جیتے ہیں زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا ہے۔ ایک عظیم فلسفہ یہ ہے کہ حقوق اللہ تو اللہ معاف بھی کر سکتا ہے لیکن جو حقوق العباد ہیں وہ اللہ تعالیٰ معاف قیامت کے دن ہی معاف کریں گے۔

اسی طرح اک اور مثال آپ دیکھیں تو عبدالستار ایدھی ہیں۔ انہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز کیا، کہیں پہ بھی آفت ہو کچھ بھی ہو آج سب سے پہلے انکی ایمبولینس پہنچ جاتی ہے چونکہ اس بندے کی کمٹمنٹ ہے۔ بعض تو چلو صنعت کار ہیں کوئی پیسے والے ہیں اہم شخصیات ہیں تو ان کے لیے کام کرنا یا کہیں سے فنڈنگ لانا، میرے خیال میں اتنا مشکل کام نہیں ہے اس کی بہ نسبت جو بالکل ایک سادہ ان پڑھ آدمی ہے۔ اسی طرح اگر آپ پاکستان میں دیکھیں تو آغا خان ہاسپٹل ہے، گلگت بلتستان کے اکثر لوگ خود بھی وہاں جاتے ہیں۔ تو جو غریب مریض ہیں وہ مفت علاج لیتے ہیں وہاں ایک ویلفیئر کا ایک نظام ہے۔ آغا خان یونیورسٹی ان کا بہت منفرد ادارہ ہے وہاں سے بہت سارے ڈاکٹرز تو باہر جاتے ہیں۔ انسانی وسائل کی ترقی میں انھوں نے مثالی کام کیا۔ مستحق طالبعلموں کو سکالرشپ دیتے ہیں اس وجہ سے میرے آئیڈیل ہیں۔ جس طرح سے پرنس آغا خان کام کر کے گئے یا میں نے عبدالستار ایدھی کا نام لیا تو ان سب کو دیکھ کے مجھے بھی موٹیویشن (motivation) ہوتی ہے بہت ہمت ملتی ہے کہ وہ بھی ہماری طرح عام بندے تھے۔

2002 یا 2003 میں مجھے سوشل ویلفیئر ڈیپارٹمنٹ نے گلگت بلتستان سے سوشل ورکر ایوارڈ کے لیے بھی بلایا تھا گولڈ میڈل کیلئے۔ کوئٹہ میں قومی سطح کی تقریب ہوئی تھی۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی انسان کی تھوڑی سی حوصلہ افزائی ہو جاتی ہے۔ گلگت بلتستان سوشل ویلفیئر ڈیپارٹمنٹ سے میرا نام منتخب ہوا تھا۔ پاکستان سوشل

ایسوسی ایشن کی طرف سے میرے کاموں کی حوصلہ افزائی ہوئی، اس طرح زندگی میں مختلف سطح پہ بہت دفعہ موٹی ویشن ملی کام کرنے کی مجھے۔

اکرام برائی کو ختم کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں اور اسکے لیے معاشرے کی دیکھ بھال کرنا اور ہاتھ سے برائی ختم کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

مجھے بہت دفعہ ذاتی طور پر دھمکیاں بھی ملیں لیکن اس میں میں آپ کو ایک بات بتاؤں کہ گھر کی طرف سے بھی اکثر پریشر کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جیسے میری ماں، بہنیں ڈانٹتی ہیں کہ فضول کام مت کرو۔ میں ان کو یہ کہتا ہوں کہ اگر میرے گھر کچھ غلط نہیں ہوتا تو اسکا مطلب یہ نہیں کہ آپکے ہمسائے میں وہ ہوتا رہے، اگر آپکے ہمسائے میں کوئی شراب نکالتا ہے تو کل آپ کا بیٹا جا کے وہ شراب پی سکتا ہے۔ برائی اگر آپ کے علاقے میں ہوگی تو وہ کسی نہ کسی حوالے سے آپ پر ڈائریکٹ یا انڈائریکٹ اثر انداز ہوسکتی ہے۔ تو آپ یہ نہ کہیں کہ میں شراب نہیں پیتا کوئی اور پیتا ہے تو پئے۔ اسکو روکنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ تاکہ ہم ایک سوسائٹی کو اچھائی کی طرف لے جائیں اگر ہم اس کو نہیں روکیں گے تو وہ پھیل جائے گی۔ بس ان کو میں یہ سمجھاتا تھا، خیر سمجھانا تو بڑوں کو نہیں ہوتا ہے لیکن یہ ہے کہ ان سے میں ڈسکس کرتا تھا کہ یہ چیزیں صحیح نہیں ہیں۔

اپنی شادی کا بتاتے ہوئے انھوں نے خاندانی برتری کی طرف اشارہ کیا اور روایتی طریقہ اختیار کرتے ہوئے اپنی شریک حیات کے انتخاب میں قریبی رشتہ دار خواتین پر مکمل انحصار کیا، وہ کہتے ہیں:

میں نے حال ہی میں شادی کی ہے جون 2011 میں۔ شادی تو ارینج میرج (Arrange Marriage) ہے اپنی فیملی میں بھی نہیں ہے۔ میری اہلیہ سیدؔ خاندان میں سے ہیں۔ کیونکہ ہمارا سیدوں میں رشتہ ہوتا ہے میں نے اپنی بیگم کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ میری کچھ کزنز تھیں انہوں نے کہا کہ اس طرح اس طرح ہے تو بس میں نے کر لی۔ میری وائف آغا خان ہیلتھ سروسز کے فیلڈ ہیلتھ آفیسر اور پورے شمشال ریجن کی ہیڈ ہیں۔ ہماری انڈرسٹینڈنگ بہت اچھی ہے دونوں ذاتی اور پیشہ ورانہ زندگی میں، ہم مسائل کو ڈسکس کرتے ہیں کافی اچھے انداز سے۔ اور مجھے لگتا ہے زیادہ عمر میں میں نے شادی کا صحیح فیصلہ کیا ہے۔

اکرام اپنی روایات سے پوری طرح آگاہ ہیں اور روایتی مردانہ تصورات پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہمارے کلچر میں شادی سے بھی مردانگی کی کچھ جڑیں جوڑ دی جاتی ہیں مثال کے طور پر مردانگی اور برتری والا جو ہمارا معاشرتی نظریہ ہے اسکے مطابق جو بیوی کو نہیں مارتا ہے تو وہ بے غیرت مرد ہے۔ بیوی کو مارنا ایک مردانگی ظاہر ہوتی تھی ہمارے کلچر میں۔ اور اس پہ فخر کرتے تھے۔ اگر آپ اپنی بیوی کے ساتھ تھوڑا ہنسی خوشی کریں تو یہ تو بڑے بے غیرت آدمی کی نشانی ہے۔ تو اب یہ ہے کہ اس میں تقریباً تھوڑی سی تبدیلی آئی ہے۔

گھر میں تشدد کے حوالے سے پرانے نظریات پر بات کرتے ہوئے، اکرام نے بہت واضح انداز میں نفسیاتی اور جسمانی تشدد کو علیحدہ کیا، عورتوں پر گھریلو تشدد کے حوالے سے اکرام نے مندرجہ ذیل باتیں بیان کیں:

پرانے دور میں تو گھریلو تشدد ایک عام روایت تھی، یہ نہیں کہ کوئی اتنا تشدد کرے کہ ہڈیاں توڑ دے۔ لیکن ڈنڈے سے مارنا یا تھپڑ مارنا اس طرح کا تھا۔ ذہنی خوف مثلاً خاتون کو انڈر پریشر رکھنے والا بھی تھا۔ تشدد تو یہ ہوتا ہے کہ آپ نے لہولہان کر دیا۔ تو مرد کو برتری قائم رکھنے کے لیے چونکہ مرد ہے اس کا دباؤ برقرار رہے اب تک یہ تھا پریشر رکھنا۔ میرے والد بھی میری ماں پہ کرتے تھے مجھے یاد ہے۔ میں بھی چھوٹی بہنوں کے ساتھ ڈانٹنے کی حد تک کرتا تھا لیکن اب نہیں، تو اس کلچر کو بھی چیلنج کرنے کے لیے میں نے خود سے سوچا تھا کہ میں اپنی بیوی پہ تشدد نہیں کروں گا۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ کہیں نہ کہیں یہ بچوں کی زندگی کو اور گھر کے باقی افراد کی سوچ پر اثر کرتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں نہ صرف گھر بلکہ جب ہم سکول جاتے تھے تو ہمارے ایک استاد بچوں کو بہت گندی گالیاں دیتے تھے۔ ماں بہن کی تو اس ٹائم ہمیں بہت غصہ آتا تھا برا بھی لگتا تھا۔ لیکن بچے تھے کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ وہ بری طرح مارتے تھے بچوں کو اور اگر گھر اور سکول دونوں کا ماحول ایسا ہو تو بچے کہاں جائیں۔ ان کی سوچ تو وہیں ختم ہو جاتی ہے۔ تو مجھے لگتا ہے نہ صرف ایجوکیشن کی سطح پر بلکہ گھروں کے ماحول اور فرسودہ رسموں کو بھی ختم کرنا چاہیے۔ بچوں کو خاص طور پر بچپن سے ایک ایسا ماحول دینا چاہیے جس میں مجھے لگتا ہے کہ ان کی ذہنی نشوونما زیادہ ہو۔ ان پہ پریشر کم ہو، ذہن کھلا رہے ان کا۔ بس یہی میری زندگی کا مقصد بھی ہے کہ دوسروں کے کام آئیں اور اپنی اور دوسروں کی زندگی کو جتنا ممکن ہو آسان بنائیں۔

اکبر

خیبر پختونخوا کے شہر صوابی کے مقامی ہسپتال میں ایک سولہ سالہ نوجوان ظفر کو لایا گیا۔ وہ گم سم اور سہما ہوا تھا، اسکے والد شفیق نے بتایا کہ محلے کے ایک لڑکے نے ظفر پر جنسی تشدد کیا تھا میڈیکل رپورٹس نے بھی اس امر کی تصدیق کردی تھی۔ شفیق اس مسئلے پر قانونی مدد چاہتا تھا مگر تجربہ نہ ہونے کے باعث لازمی تفصیلات سے ناواقف تھا۔ روایتی انداز میں عزت کے تحفظ کی خاطر صوابی میں اکثر ایسے واقعات کو منظر عام پر نہیں لایا جاتا۔

اکبر بھی صوابی کے رہنے والے ہیں اور رضا کارانہ خدمات میں بڑا نام رکھتے ہیں۔ انہیں ظفر کے ساتھ ہونیوالی زیادتی کا انکے ایک دوست کے ذریعے پتہ چلا تو وہ فوراً ہسپتال پہنچے، انھوں نے شفیق سے تفصیلی ملاقات کی، اُسکا حوصلہ بڑھایا۔ ظفر کی رپورٹس کے مطابق FIR درج کرانے میں مدد دی، بعدازاں ظفر کے لئے وکیل کا بندوبست کیا اور کیس کی پیروی کے لئے مالی طور پر بھی تعاون فراہم کروایا۔

اکبر سے میری پہلی ملاقات صوابی میں واقع انکے سماجی خدمت کے مقامی دفتر میں ہوئی۔ میرے پہنچنے پر اکبر اپنے چند دوستوں کے ساتھ سیاسی اُمور پہ تبادلہ خیال کررہے تھے۔ ٹیلی فون کے ذریعے ہمارا تعارف ہو چکا تھا اور انھیں میری آمد متوقع تھی، انھوں نے میرا پرتپاک استقبال کیا اور دوستوں سے میرا تعارف کروایا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد ان کے تینوں دوستوں نے اجازت چاہی اور ہماری بات چیت رسمی انداز میں شروع ہوئی۔ موضوع کی طرف آتے ہمیں زیادہ دیر نہ لگی۔ اکبر نے اپنی ابتدائی زندگی کے احوال کا احاطہ کرتے ہوئے بتایا۔

میری پیدائش صوابی کی ہے، اور یہ علاقہ جہاں ہم بیٹھے ہیں فقیر آباد کہلاتا ہے۔ یہ ہمارے دادا کے نام پہ آباد ہے، انکا نام فقیر شاہ تھا۔ میرے والد پولیس میں انسپکٹر تھے۔ انکا نام عبدالغفور شاہ تھا۔ ہم تین بھائی اور تین بہنیں ہیں، تینوں میں میں سب سے چھوٹا ہوں، ہم تینوں بھائی ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے ہیں اور ایک ہی ساتھ ہوتے ہیں ابھی تک، شکر الحمدوللہ۔ والد اور والدہ وفوت ہو چکے ہیں، اپنے سکول میں میں عام سا تھا نہ اتنا قابل نہ اتنا نالائق لیکن یہ تھا کہ کھیلوں میں اور سکول کی باقی سرگرمیوں میں زیادہ حصہ لیتا تھا مثلاً فٹبال، کرکٹ وغیرہ جو بھی مجھے موقع ملتا تھا، میں اس میں حصہ لیتا تھا۔ دن گزرتے گئے اور 1974 میں ہم یہاں صوابی سے سوات چلے گئے کیونکہ ہمارے والد کا وہاں تبادلہ ہوگیا تھا اور پھر ہم نے 1985 تک وہاں زندگی گزاری، لیکن میں نے تعلیم صوابی میں ہی حاصل کی، میں یہاں پڑھتا تھا اور پھر چھٹی والے دن جمعرات کو سوات چلا جاتا اور ایک دن بعد واپس آجاتا۔

اکبر کی زندگی کا ایک اہم حصہ سوات میں گزرا جہاں ان کے والد کا تبادلہ ہوا تھا، وہاں کی یادوں کو اکبر نے یوں بیان کیا:

ہم نے گیارہ سال سوات میں گزارے تھے اور بعد میں ڈھائی سال ایبٹ آباد میں رہے۔ ابو کا جہاں تبادلہ ہوتا وہ کوشش کرتے کہ اپنی بیٹیوں کی خاطر وہاں پر مکان لے لیں کیونکہ ہم بہن بھائی ایسے تھے کہ کسی چچا کی ایسی اولاد نہ تھی، ہم سب ماشاءاللہ جوان تھے۔ باہر ہم جہاں بھی رہے ہمیں کھلی آزادی تھی۔ والد ہمارا ہر قسم کا خیال رکھتے تھے۔ اس طرح ،جیسے کسی نے اپنے بیٹوں کو فلم دیکھنے کی اجازت نہیں دی ہوگی لیکن سوات میں ہم والدہ کے ساتھ بیٹھ کے فلم دیکھتے تھے۔

اتوار کو وہاں پہ فیملی شو ہوا کرتا تھا تو اسکی بھی ہمیں اجازت ہوا کرتی تھی، ابو کے کچھ دوست ہمارے لئے جگہ بک کرواتے اور ہم چلے جاتے۔ جب وہ اکیلے ہوتے تھے تو انکا رویہ ہی بدل جاتا، لیکن جب دادا کے گھر آتے تو یہاں ریڈیو سننا بھی کفر تھا۔

سوات میں ہمارے ساتھ اکثر ہم جیسے لوگ ہی ہوتے تھے یعنی پشاور اور مردان وغیرہ سے تعلق رکھنے والے کیونکہ سوات کے لوگ باہر کے لوگوں کو قبول نہیں کرتے تھے وہ ہمیں ایوب خان کے علاقے کا سمجھتے تھے کیونکہ ایوب خان نے سوات کی بادشاہی چھینی تھی۔ خود کو وہ پہاڑی لوگ کہتے تھے اور ہمیں زمینی یا نیچے علاقے کے لوگ سمجھتے تھے۔ اس لئے ہم باہر کے لوگوں کا جو وہاں پہ آباد تھے ایک الگ گروہ تھا، ہمارا اٹھنا بیٹھنا کہیں آنا جانا سب اکٹھے ہوتا تھا۔ کسی فنکشن میں جانا ہوتا تو اکٹھے ہی جاتے تھے۔

والد کی نوکری، مشکلات اور عام برتاؤ کے بارے میں اکبر بتاتے ہیں:

ہم مشترکہ خاندان میں رہتے تھے۔ اس وقت حالات کچھ اور تھے، مجھے یاد ہے والد صاحب جب دفتر سے آتے تھے تو اتنے تھکے ہوئے ہوتے تھے کہ ہم ان کا سامنا نہیں کرسکتے تھے اور دور سے ان کو سلام کرتے اور اپنے چچا کے کمرے میں بیٹھ جاتے۔ پھر جب وہ آدھا پونا گھنٹہ دیر آرام کر لیتے تو ہم ان کے سامنے جاتے تب وہ حال احوال پوچھتے۔ ہمارے والد بہت ایماندار تھے، آپ اس سے اندازہ لگالیں کہ ہم نے ٹی وی ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد خریدا، کئی دفعہ ان کے پاس گھر آنے کے پیسے نہیں ہوتے تھے تو وہ آٹھ، دس کلومیٹر پیدل آتے اور کوئی پوچھتا تو کہتے ویسے ہی walk کر رہا ہوں۔

مجھے یاد ہے ہم دوست عید کے دن اکٹھے ہوا کرتے تھے کیونکہ ہماری عید ایک دن پہلے ہوتی تھی اسلام آباد اور مری میں ایک دن بعد ہوتی تھی۔ ہم پہلی عید کے دن شام کے وقت نکل لیتے تھے۔ تو مری میں دو دن سنانا ہوا کرتا تھا۔ ہم وہاں پر جا کر کمرے کی بکنگ کرواتے تھے، اور جب وہاں کے مقامی لوگ آتے تھے تو ہم اپنا مزہ کر چکے ہوتے تھے۔ ایک دفعہ جب تین چار دن کے بعد آئے تو والد صاحب کہتے ہیں خان کہاں گئے تھے۔ میں نے ذرا خاموش ہو کے کہا کہ مری گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ کس سے پوچھ کے گئے تھے۔ تو میں نے والدہ کی طرف دیکھ کے کہا کہ بے بے سے پوچھ کر گیا تھا تو انھوں نے کہا کہ بھائی خالی ٹوپی کو سلام نہیں کرتے جب ٹوپی والا ہو تب سلام کرتے ہیں۔ وہ ہمیں منع نہیں کرتے تھے لیکن اُن کا انداز ذرا سخت تھا۔

اپنے سکول کے دور سے ہی اکبر کو سپورٹس میں خاص دلچسپی رہی، وہ گیمز میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے انھوں نے اپنی تفریحی سرگرمیوں پر مزید کہا:

کالج میں مَیں ہاکی اور یوتھ ہائیکنگ کلب کا کپتان تھا اور ضلعی سطح کی ٹیم کا مَیں نائب کپتان رہا، اس طرح بچپن سے ہی مجھے کوئی نا کوئی نمائندگی ملتی رہی، پتہ نہیں اس میں اللہ کا کیا راز تھا۔ ماڈل ہائی سکول کی ہاکی ٹیم کا مَیں کپتان رہا، اس کے بعد ڈسٹرکٹ ہاکی ایسوسی ایشن میں کافی عرصے تک مَیں وائس کپتان رہا، کامرس کالج میں دو مرتبہ مجھے انڈر 19 کی پیشکش ہوئی تھی ان کا کیمپ کیونکہ کوہاٹ میں تھا اس لئے والدین اتنی دور جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ کھیلوں میں ہاکی میری زندگی تھی، ہمیں نہ کھانے کا ہوش ہوتا نہ پینے کا بس ہر وقت ہاکی کھیلتے رہتے۔ ہماری سب سے بہترین آزادی ہاکی تھی۔ میری کِٹ اور ہاکی ہماری دوکان کے پیچھے پڑی ہوتی تھی۔ میں تو کبھی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ میں

کبھی گراؤنڈ کے باہر ہونگا اور پھر اللہ نے ایسے امتحان میں ڈالا کے تمام زندگی ڈسٹرب ہوگئی۔

نوجوانی میں ہی اکبر کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے اُن کے آنے والے دنوں اور حالات پر گہرے اثرات ڈالے، اکبر کہتے ہیں:

مارکیٹ میں ہماری دکان تھی اور یہ محرّم کی دو چھٹیوں کی بات ہے جب مارکیٹ کے سب لوگوں نے اکٹھے کالام جانے کا پروگرام بنایا اور فیصلہ ہوا کہ اگر پیچھے کسی نے بھی دکان کھولی تو اسے دوسو روپے جرمانہ ہوگا۔ اس وقت میرا بڑا بھائی یونین کا جنرل سیکرٹری تھا، سب خوشی خوشی کالام چلے گئے تو پیچھے ایک آدمی نے دکان کھول دی۔ میرے چھوٹے بھائی نے مذاق میں اسے کہا کہ تمھاری خیر نہیں وہ لوگ آئیں گے اور آپ کو دوسو روپے جرمانہ کرینگے، اِس بات پر سب اسے تنگ کررہے تھے۔ وہ آدمی نہایت کنجوس تھا تو اس نے ٹریڈ یونین کو گالیاں دینا شروع کردیں۔ بھائی نے کہا کہ گالیاں نہ دو اس میں میرا بھائی بھی ہے تو اس نے کہا کہ وہ میرا کیا کرلے گا اور ساتھ ہی اس نے گندی گالیاں دینا شروع کردیں۔ میرے بھائی نے کہا ایک تو تم نے غلطی کی اور اوپر سے گالیاں دیتے ہو تو بھائی نے اس کو مارا اور اسکے منہ اور چہرے سے خون نکل آیا، میں تو تب چھوٹا تھا۔ بعد میں صلح بھی ہوگئی اور یہ فیصلہ ہوا کہ دو آدمی مارکیٹ کے اور دو میرے بھائی ان کے گھر جائیں گے اور ان کی تسلی کرائیں گے کہ آپ ہم سے بڑے تھے اور ہم نے غلطی کی ہے۔

لیکن اسکے باوجود اس بدبخت نے اپنے سالے کے کہنے پر سوچا کہ چھوڑو یہ تو سب بابو قسم کے لوگ ہیں اور ہم ان سے مار کھا گئے ہیں اور ان کو ہم سبق سکھائیں گے۔ یہ لوگ جب آئے تو آتے ہی لڑائی شروع کردی۔ میرے بڑے چچا نے کہا کہ بیٹھ جاؤ سڑک پہ کیوں گالیاں دیتے ہو، آرام سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں، لیکن انھوں نے کہا کہ ہم تمھیں مکئی کے دانوں کی طرح بھون ڈالیں گے۔

وہ اسلحے سے لیس تھے، میرے چچا نے کہا کہ جو فائر کرتے ہیں وہ باتیں نہیں کرتے لیکن ہم آپ کی عزت کرتے ہیں اور آپ بیٹھ جائیں ورنہ ہم بھی یہ کرسکتے ہیں، لیکن انکا ذہن بنا ہوا تھا کہ بس یہ بابو قسم کے لوگ ہیں دو، تین تھپڑ ماریں گے تو یہ بھاگ جائیں گے اور اس طرح ہماری بدمعاشی بھی بن جائے گی۔ ہم لڑائی جھگڑے والے لوگ نہیں تھے، پستول اور بندوق گھر میں تو تھے لیکن اس کا استعمال ہم نے صرف شکار کے لیے ہی کیا تھا، میرے ایک جاننے والے نے کچھ رقم دینا تھی جس کے بدلے اس نے مجھے پستول دیا تھا، میں نے یہ سوچ کے رکھ لیا کہ بیچ کر رقم وصول کرلوں گا، بدقسمتی سے وہ اس دن میرے پاس تھا، جب ہم لوگوں نے دیکھا کہ یہ نہیں سمجھ رہے تو ہم اپنے ڈبل سٹوری مکان کی چھت پر چڑھ گئے، جب ان لوگوں نے فائرنگ شروع کی تو ہم نے بھی جواباً فائرنگ کردی، ہم دو آدمی اس میں زخمی ہوگئے اور وہ تقریباً چار زخمی ہوے اور ایک موقع پہ ہلاک ہوگیا تھا۔ جس کو وہ شیر بنا کر لائے تھے وہ گیدڑ کی طرح مرگیا تھا۔ اللہ نے ہمیں عزت دی اور ہم نے مار نہیں کھائی، 35 منٹ تقریباً فائرنگ ہوئی تھی اور میری لائف کا جو ایک چینل جاری ہوا تھا اس وقت میں بالکل پیک (Peak) پہ تھا۔ MSF کا میں ڈویژنل جنرل سیکرٹری تھا، کلب میں ہاکی کا کپتان بھی تھا۔ اچھی عزت ملی ہوئی تھی اللہ کی طرف سے اور بس اس سال زندگی میں ایسا سیلاب آیا کہ سب کچھ بہالے گیا۔ میرے دونوں پاؤں پہ سات گولیاں لگی تھی لیکن اللہ کا فضل ہے کہ ہڈیاں بچ گئی۔ پھر جیل گیا 9 مہینے کے لئے اور پھر ایسا سلسلہ ٹوٹا کہ ابھی تک کچھ نہیں ہوا۔ جیل سے آنے کے بعد حالات سازگار ہوگئے تھے اور اللہ کے فضل سے، دوستوں کے تعاون سے اور لوگوں کی دعاؤں سے دوبارہ میں اس مقام تک پہنچا۔ اتنے اچھے اچھے قابل اور مالدار لوگ میرے ساتھ ہیں۔ اس

واقعے کے بعد بھی انھوں نے ہم پہ قاتلانہ حملہ کیا۔ ایک دن میں اور میرا بھائی دکان کھول رہے تھے اور سڑک کی طرف ہماری پشت تھی، انھوں نے موقع پا کر ہم پر مکمل برسٹ فائر کردیا، دکان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گولیوں نشان تھے، ہمارے پاس بھی پسٹل تھی لیکن ہمیں موقع نہ مل سکا۔ اللہ کا شکر ہے میں بچ گیا لیکن میرا بھائی کافی زخمی ہوا تھا۔ اسکے بعد ہم نے صلح کے مختلف آپشنز پہ بات کی لیکن وہ جس قسم کی صلح چاہ رہے تھے ہم وہ نہیں کرپا رہے تھے، وہ سوارہ چاہتے تھے لیکن ہم نے انکار کردیا تو انھوں نے کہا ہم تمہیں اب دیکھ لینگے اور اس طرح یہ دشمنی اب بھی چل رہی ہے۔

ایک اور اہم واقعہ، جس نے اکبر کی زندگی کا رخ یکسر تبدیل کردیا، اسکی بچپن کی منگنی کا تھا، اکبر اپنی ماموں زاد سے بہت محبت کرتا تھا، وہ کہتا ہے:

میری منگنی ماموں زاد سے ہوئی تھی، وہ جب پیدا ہوئی تو میں چوتھی جماعت میں تھا، پیدا ہوتے ہی وہ میرے نام ہوگئی تھی۔ میری سات خالائیں اور ایک ہی ماموں تھا اس لئے سب کے لئے لاڈلے تھے ماموں، وہ بھی خوش تھے اور میں بھی۔ کیونکہ وہ تصور ہوتا تھا کہ ہم ایک ہی گھر میں رہیں گے، جب بھی ہم سوات سے صوابی آتے تو سیدھا انکے گھر جاتے تھے۔ اسے دیکھ کے خوشی ملتی تھے دل کا ٹکڑا جو تھا اور انکو بھی میرے خیال میں یہی ہوا کرتا تھا۔ 1999 میں جب میری شادی کی تاریخ طے ہورہی تھی تو پتہ نہیں اللہ کو کیا منظور تھا کہ میرے ماموں نے چڑ چڑا پن دکھایا، میرے ماموں اور ابو آپس میں چچازاد تھے، میرے بھائیوں کے سسر ہونے کی وجہ سے ہمارا تعلق ماموں کے باقی رشتے داروں کے ساتھ قریبی تھا۔ ماموں نے غصے میں کوئی بات کی تو میرے بھائیوں نے کہا آپ ہمارے ماموں ہیں لیکن اپنے سسرال اور اپنے چچاؤں کے سامنے تو ہماری بے عزتی نہ کریں، وہ اور بھی غصہ ہوگئے کہ آپ مجھے جواب دیتے ہو اور بات بگڑ گئی۔ میں دکان میں تھا جب یہ لوگ واپس آئے۔ میں خوشی خوشی گھر آیا کہ یہ تاریخ لے کر آگئے ہونگے، جب میں اپنے پُل پہ پہنچا تو مجھے میرے بھتیجے نے کہا کہ مزے کرو، مجھے اس بات پہ تعجب ہوا جب گھر پہنچتا ہوں تو ماحول کچھ اور ہے والد صاحب علیحدہ غصے میں بیٹھے تھے، بھائی علیحدہ کمرے میں غصے میں تھے اور والدہ تو رو رہی تھی برآمدے میں۔ خیر میں خاموش ہو کے اماں کے ساتھ برآمدے میں بیٹھ گیا۔ میں نے کہا کہ کیا بات ہے وہ اور بھی رونے لگی، میں نے کہا کہ آخر بات کیا ہے، دوسرا بھائی کمرے سے نکلا اور کہا کہ بس تمھاری شادی ہم کہیں اور کرینگے، میں نے کہا بات کیا ہوئی ہے بات تو بتائیں، اماں کی طرف دیکھا تو وہ رو رہی تھی مجھے رنج بھی ہورہا تھا اور غصہ بھی آرہا تھا کہ اماں رو رہی ہے اور مجھ سے یہ کہا جارہا ہے کہ ہم آپکی شادی کہیں اور کررہے ہیں۔ میرے اصرار پہ اماں نے سارا واقعہ مجھے بتایا، میں نے کہا کہ اماں کوئی بات نہیں۔ آپ سوچ لیں کہ میں اس وقت کوئی سٹپ نہیں لے رہا تھا کیونکہ اپنے بھائیوں کو بھی نیچا نہیں دکھا سکتا تھا اور اماں کا بھی ایک ہی بھائی تھا، میں سخت مشکل میں پڑ گیا تھا اور رات مجھے اتنا تیز بخار ہوگیا تھا کہ دو بجے کے قریب مجھے ہسپتال لے گئے، تقریباً میں دو دن ہسپتال میں تھا۔ وہ میرے لئے بہت مشکل وقت تھا۔ ایک دو مہینے اتنے تھے کہ میں بیان نہیں کرسکتا، میں نے اپنا فیصلہ اماں پہ چھوڑ دیا اور انھوں نے کہا کہ ٹھیک ہے اسکو چھوڑ دو، میرے لئے یہ انتہائی مشکل تھا۔ اپنا دل بہلانے کے لئے میں نے VCR خرید لیا کہ چلیں اس پہ فلم دیکھ لے تو موڈ ٹھیک رہتا ہے اور والدہ رات گیارہ بجے تک میرے ساتھ کمرے میں رہتی تھی، کہتی تھی کہ سب کے سب اپنے کمروں میں خوش ہیں کیونکہ دو بڑے بھائیوں نے شادیاں کی ہیں اور تم نے نہیں کی تو چلو میں تمھارے ساتھ یہاں بیٹھوں گی تو اس سے تمھارا غم تبدیل

ہوگا، شاید ماموں نے سوچا ہو کہ میری اتنی حیثیت نہیں بھائیوں کے مقابلے میں، بعد میں انھوں نے بہت کوشش کی لیکن ہم نہیں مانے، اسکے بعد میں ماموں سے نہیں ملا تقریباً 13 سال ہونے کو ہیں۔ اسکے بعد میری شادی والدین کی مرضی سے قریبی لوگوں میں ہوئی۔ الحمدللہ اب میرے تین بچے ہیں اور انکی والدہ ملازمت پیشہ خاتون ہیں۔

اکبر کے والد مقامی روایات کے مطابق اپنے بہن بھائیوں کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن اسکی وجہ سے انکے اپنے خاندان پر بھی اثرات پڑتے تھے، اکبر بتاتے ہیں:

ہمارے جو سب سے چھوٹے چچا تھے انکی فطرت تھوڑی لومڑی والی تھی وہ جب بھی ابو کے ساتھ آ کر بیٹھتے تو کہتے کہ آج تو ہماری بھابھی نے یہ کیا، مطلب ایسی بات بتاتے جو انہیں ناگوار گزرتی بس پھر ہماری والدہ کی خیر نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت ہمارے گھر میں ایک ہی کمرہ ہوتا تھا اور میں والدہ کو روتا دیکھ کر بے چین ہو جاتا تھا۔ جب دادا کی وفات ہوئی تو ان چچا کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے گیارہ کنال زمین انکے نام کی کہ اسے اسکی شادی ہوگی۔ بعد میں میری خالہ اور میری امی نے اپنا زیور دے دیا اور کہا کہ وہ زمین ہمارے نام کروا دو۔ دعاءِ خیر ہوگئی، چچا کی شادی بھی بہت دھوم دھام سے ہوئی، تین دن تک کھانا دیا جاتا رہا۔ تو میری نانی نے اس وقت میری والدہ سے کہا کہ اپنے شوہر سے کہو کہ اپنے بھائیوں سے انگوٹھا لگوا لے کیونکہ کل سب کے بچے ہونگے تو یہ حالات نہیں رہیں گے، بچے ہونگے تو یہ بھائی نہیں رہیں گے۔ جب اماں نے یہ بات کہی میرے والد کو تو انھوں نے کہا اچھا اب میں اپنے بھائیوں سے انگوٹھا اسلئے لگاؤں کہ تم نے زیور دیے ہیں اور اماں کی خوب پٹائی کی، بس اسکے بعد اماں پہ نانی کی طرف جانے پر پابندی بھی لگ گئی، وہ چھ چھ ماہ تک ان سے ملنے نہ گئی، ان کی دو بیٹیاں ایک ہی گھر میں تھیں لیکن وہ بیچاری کسی سے نہ مل سکتی تھی۔ اس کے بعد جب وراثتی تقسیم کا وقت آیا تو تو اس چچا نے سب بہنوں بھائیوں کے ساتھ میٹنگ کی اور انکو تیار کیا کہ اپنا حصہ وصول کرنا ہے میرے والد سے، میری والدہ اور خالہ نے جو زیور دیئے تھے انکا کوئی ذکر نہیں تھا، سب نے اپنا حصہ لیا اور چلتے بنے۔ میری والدہ نے بھڑاس والد پہ نکالی لیکن پھر جواباً ان پر تشدد کیا گیا۔ دکھ اس بات کا ہے کہ یہ لوگ جو ہمارا حق تھا وہ تو چھوڑتے۔ اس میں جس طرح ہمارا ہمارا شرعی نظام ہے کہ لکھ پڑھ کے ساتھ یہ چیزیں ہوتی ہیں ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

اکبر سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لے چکے ہیں، اپنی کامیابیوں کا انھوں نے یوں بیان کیا:

میں 2005 - 2000 تک اپنی اسی یونین کونسل کا نائب ناظم بھی رہ چکا ہوں۔ کاغذاتِ نامزدگی جمع ہونے کے بعد جب ہمارے اثاثوں کی جانچ پڑتال ہو رہی تھی۔ جب میری باری آئی تو سول جج کے سامنے ایک فارم مجھے دیا گیا کہ یہ بھر دو تو مجھے ہنسی آ گئی۔ اس نے وجہ پوچھی تو میں نے کہا جی میرے پاس تو ایک سائیکل ہے اس نے کہا کہ کیوں پھر اتنے بڑے آدمی کے خلاف الیکشن لڑ رہے ہو، میں نے کہا کہ میرا ذاتی مسئلہ ہے لیکن حقیقت یہی تھی کہ میرے پاس ایک سائیکل تھی۔ میں نے وہ فارم بھر کے دیا اور پھر وہ تصدیق ہو کر واپس دفتر پہنچا، جس میں میری ایک دوکان اور سائیکل آئی اور جس کے خلاف میں الیکشن لڑ رہا تھا وہ جب الیکشن مہم پہ نکلتے تو گیارہ بارہ گاڑیاں ساتھ ہوتی تھی۔ میرا کل خرچہ 85000 روپے ہوا تھا، ہم نے اپنا دفتر بھی ایک دکان خالی کر کے بنایا تھا جبکہ دوسری طرف آفریدی تھے جو اس علاقے کے امیر ترین اور سیاسی اثر ورسوخ والے لوگ تھے۔ اللہ نے ہمیں عزت دی اور ہم تقریباً 700-600 ووٹوں کی برتری سے جیتے۔ اسی الیکشن میں جب ہم پینل بنا رہے تھے تو ہمارے پاس چھ میں سے پانچ خواتین موجود تھیں لیکن ایک سیٹ

کا مسئلہ تھا ہم کافی دوڑ دھوپ کر رہے تھے لیکن مسئلہ حل نہ ہوا، میں کافی پریشان تھا۔ گھر پہنچا تو والد نے پوچھا کہ کیا کیا آپ لوگوں نے خواتین کونسلرز کا؟ میں نے کہا بس پانچ بڑے خاندانوں میں سے خواتین لی ہیں لیکن ایک سیٹ کم ہے تو انہوں نے کہا کہ یہ تو کوئی مسئلہ نہیں، انھوں نے کہا کہ تمھاری بیوی جو ہے، مجھے دھچکا سا لگا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں اور حیران ہو کر پوچھا کیا؟ تو انھوں نے کہا کہ تمھاری بیوی تمھارے ساتھ خاتون کونسلر ہوگی، انھوں نے اسی وقت مجھے فیس دے کر کہا کہ جاؤ اور کاغذات جمع کراؤ، میری تو اس وقت خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میری بیوی بعد میں بلا مقابلہ منتخب ہوئی اور یونین کونسل میٹنگز میں شرکت کرنے لگی۔

مخالفین کہہ رہے تھے کہ اکبر کی بیوی ہمارے ساتھ کونسلر ہوگی یہ تو جیت نہیں سکتا ہم سے، ہم نے کہا کہ ہم نے اتنا سٹپ لیا اپنی بیوی کو میدان میں لا کر، تو اللہ ہمیں عزت دے گا اور بیشک اللہ نے مجھے وہی عزت دی۔ اور مجھے اطمینان ہوا ہم جو دوسروں کو بتاتے ہیں کہ عورتوں کو حقوق دو تو خود اسکی مثال پیش کرنے کے قابل بھی ہو گئے ہیں۔

زمانے کی تبدیلی پر اکبر نے دلچسپ انداز میں بیان کیا:

پرانے وقتوں میں ہم دوستوں کے ساتھ بلا خوف نہر میں نہاتے تھے اور بعض اوقات بغیر کپڑوں کے ہی گھر آ جاتے تھے اور کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑتا جو آجکل کے دور میں ناممکن ہے۔

ایک تیس سالہ شخص کی بیوی اور گھر والوں سے ناراضگی ہوگئی اور اسنے اپنی خالہ کے گھر پناہ لی ہوئی تھی۔ تین چار مہینے بعد اس بد بخت نے اپنی سولہ سالہ خالہ زاد کو بھگا لیا، یہ صلہ دیا اس نے اپنے محسن خاندان کو۔ اب وہ عزت، احترام ختم ہو گیا ہے آج کل دوسروں پر کیا کوئی اپنے بھائی پر اعتبار نہیں کر سکتا اور آپ تبھی محفوظ رہ سکتے ہیں جب آپ محدود رہیں۔

جنسی تشدد کے ایک واقعے میں اکبر نے ایک مثبت کردار ادا کیا، تفصیل بتاتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

ہمارے قریبی یونین کونسل کا واقعہ ہے کہ ایک سولہ سالہ لڑکے ظفر کے ساتھ کسی نے بدفعلی کی، مجھے اسکا پتہ اپنی ایک ساتھی جو اسی علاقے میں رہتی ہیں سے چلا۔ انھوں نے بتایا کہ اسکو ہم ہسپتال لائے ہیں، میں تھوڑی دیر میں ہی ہسپتال پہنچ گیا۔ وہ لڑکا اچھی خاصی شکل کا تھا ہم اسکے ساتھ بیٹھ گئے اور بتایا کہ اکثر ایسے ہوتا ہے۔۔۔ کسی کیس میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو پھر انکے مدعی پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔۔۔ کسی کے ہم نے کیس وغیرہ تیار کیا تو وہ۔۔۔ بہت سارے لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو آپ لوگوں کی مرضی تھی۔۔۔ لڑکے کے والد کے کہنے پہ پر جب ڈاکٹر سے میری ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ ہم اسکا میڈیکل کرتے ہیں، میڈیکل سے پہلے میں انکے ساتھ بیٹھ گیا اور واقعے کی تفصیلات پوچھیں۔ لڑکے نے کہا کہ میں آ رہا تھا اور یہ لڑکا مجھے کافی دنوں سے تنگ کر رہا تھا، جب میں سکول سے نکلا تو میرے ساتھ یہ کام ہوا۔ میں نے کہا دیکھو ہماری تو یہ کوشش ہے کہ ہم آپ لوگوں کے لئے دوڑ دھوپ کر سکتے ہیں اور دوڑ دھوپ بھی وہی کر سکتے ہیں جو ہمارے اختیار میں ہے، ہم آپ کے لئے بندوق اٹھا نہیں سکتے ہاں آپ کے لئے کیس چلا سکتے ہیں، ہم آپکے لئے پولیس کے پاس جا سکتے ہیں، ہم آپکو یہاں ہسپتال لا سکتے ہیں ہم آپکے لئے پیسے نہیں لگا سکتے، ہم عدالت میں آپکے لئے وکیل کا بندوبست کر سکتے ہیں، لڑکے نے کہا آپکی مہربانی ہوگی ہم بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ پھر میڈیکل ہوا اور ہم ساتھ ہی موجود پولیس چوکی جس میں ایک پولیس اہلکار اور ایک ISI کا بندہ تھا چلے گئے، پولیس والے نے لڑکے سے تفصیل سنی اور FIR درج کر دی۔ پھر کچھ دنوں بعد ہم نے پتہ کیا تو اسکے والد نے بتایا کہ پولیس والے اس آدمی کو گرفتار نہیں کر رہے، میں نے کہا کہ خیر آپ یہ باتیں چھوڑیں، میں نے لڑکے کا حال پوچھا، پھر ایک دن ہم انکے گھر چلے گئے، میں نے دیکھا کہ وہ لڑکا کچھ

ڈپریشن میں تھا وہ سٹوڈنٹ نہیں لگ رہا تھا۔اس نے زیادہ وہ چیز ذہن پہ لے لی تھی پھر ہم نے کیس کیا اور ایک فلاحی ادارے سے مالیت کا انتظام کیا پھر وہ کیس چلتا رہا پھر اسکے درمیان ہی انھوں نے راضی نامہ کرلیا کیونکہ وہ لڑکا بھی جوان ہو رہا تھا اور وہ کیس حل نہیں ہو رہا تھا اور جب یہ لوگ عدالت جاتے تو لوگ پوچھتے تھے کہ آپ لوگوں کا کیا مسئلہ ہے کس سلسلے میں آتے ہو تو وہ اسی پریشانی سے بچتے تھے اور کسی کو بتا بھی نہیں سکتے تھے کہ میرے بیٹے کے ساتھ یہ چیز ہوئی ہے، اکثر اسکے والدین کہیں اور بیٹھ جاتے اور ہم ٹالنے کے لئے اکثر لوگوں کو کہتے کہ کسی ذاتی کام سے آئے ہیں۔راضی نامہ کرنے کے بعد بھی وہ لڑکا اب پہلے حال میں نہیں ہے، ذہنی توازن کھو چکا ہے۔

اس کیس میں مخالفین نے پتہ لگایا کہ یہ مدعی تو بہت کمزور ہے اور اس قابل نہیں کے وکیل کے خرچے برداشت کرے، ان کو پتہ چلا کہ سابق نائب ناظم ان کے پیچھے ہے اور سپورٹ کر رہا ہے تو اس نے ایک ملاقات کی ہم سے اور کہا کہ ہم انکے ساتھ صلح کرتے ہیں۔ہم نے کہا کہ نہ ہم صلح کو روکتے ہیں نا صلح کے ہم مخالف ہیں۔اگر اسکی اس میں عزت ہے یہ سمجھتے ہیں کہ اس صلح میں عزت ہے تو بیشک اس طرح کریں لیکن اسکے آگے عزت نہیں ہے تو پھر پھر ہم اسکو کہیں گے صلح میں آپ حصہ نہ لیں، اس نے کہا کہ یہ ہمارا کام ہے اسکے جو تحفظات ہیں وہ ہم پورا کریں گے لیکن کم سے کم اس کیس کو زیادہ اچھالا نہ جائے اور نہ ہی کیس کو زیادہ دور تک لے جائیں۔ہم نے کہا اللہ کی رضا کے لئے ہم انکے ساتھ کام کر رہے ہیں۔۔۔یہ نہیں کہ انکے ساتھ کرتے ہیں کسی کے ساتھ بھی تشدد ہو اور کسی آدمی نے اپنی بیوی کے ساتھ ظلم کیا ہو، اسکے جہیز کا مسئلہ ہے یا اسے گھر بھیج دیا ہو، اسکو حقوق نہیں دے رہے ہوں ہم انکے لئے بھی آواز اٹھاتے ہیں یہ تو پھر بھی مرد ہے مردوں کے لئے تو ہم سب کچھ کرتے ہیں، آپ نے جو کام کیا ہے وہ تو کرنے کے قابل نہیں ہے۔

اکبر ایک روایتی کلچر میں رہتے جہاں ہیجڑوں کے حوالے سے لوگوں میں acceptance بہت کم ہے، اپنے ایک تجربے کہ بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

جب ہم ہیجڑوں کو دیکھتے ہیں تو ہمارے ذہن کچھ اور ہوتے ہیں، ہم کہتے ہیں یہ تو خوشحال گھرانا ہے لیکن جب آپ انکے اندر جائیں گے تو آپ کو ان کے مسائل کا پتہ چلے گا، مجھے احساس ہوا کہ ہیجڑے جو بظاہر ہمیں نظر آتے ہیں اصل میں وہ کچھ اور ہوتے ہیں، سرخی لگا کر اور تیار ہو کر رہتے ہیں لیکن جب آپ انکے مکانوں میں جاتے ہیں، آپ پر بہت اثر ہوتا ہے تو اس لئے مجھے ان پر ترس آرہا تھا۔پہلے ہم سمجھتے تھے کہ یہ بے غم لوگ ہیں لیکن قریب گئے تو معلوم ہوا کہ وہ تو مجبور سے مجبور ترین لوگ تھے۔ہمارے کچھ دوستوں کو جب پتہ چلا کہ ہم نے ہیجڑوں کو بلایا تھا تو ان کی طرف سے وہ سپورٹ نہیں ملی جو ویسے فلاحی کاموں میں ملتی تھی۔اس وجہ سے میں رکا نہیں اور اپنا کام پورا کیا۔

اکبر کو کچھ گروپس کے ساتھ کام کرنے میں مسئلہ رہتا تھا جن میں سے ایک گروپ ہیجڑے تھے، وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

لیکن ہمیں اس میں یہ مسئلہ ہوا تھا کہ اس کام کے مکمل ہوتے ہی ہماری آپس کی جو دوستیاں تھی وہ ختم ہو گئی تھی، جیسے آسمانی بجلی گرتی ہے ایسے ہوا تھا۔

شائد اسکی وجہ یہ تھی کہ ہیجڑوں کو کبھی میں نے نماز پڑھتے نہیں دیکھا، دوسرا یہ جو صاف لوگ ہوتے ہیں وہ ایسے آپکو پسند کرتے ہیں کہ یہ لڑکا خدائی خدمتگار ہے، دوسروں کے لئے کام کرتا ہے بیشک وہ آپکو سپورٹ نہیں کریں آپ انکے لئے اچھے ہوتے ہیں اور جب آپ ایسے گروپ میں ہوتے ہیں تو وہ بیشک آپکو ڈائریکٹ نہیں کہتے، آپ کے خلاف یا آپ

کے حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ اسکو تو چھوڑو وہ تو وہاں پہ بھی اس طرح کے کام کرتے ہیں تو لوگ محسوس کرتے ہیں اور وہ ہمارے لئے بہت بدقسمتی ہوتی ہے، اسی طرح سیکس ورکرز کے ساتھ کام کرنے سے بھی میں نے توبہ کی ہے، ایک دفعہ ایک ایسی عورت سے واسطہ پڑا جو تھانے میں اپنے شوہر کے ساتھ موجود تھی، پولیس والے ایک نوجوان لڑکے کو اس عورت پر زبردستی کرنے کے جرم میں پکڑ لائے تھے لیکن اس عورت نے تھانے میں بلا جھجک اپنی چوٹوں کے نشان دکھائے جسکے بعد میں نے سوچا کہ اس طرح کی عورتوں کا کیا بھروسہ وہ کچھ بھی کر سکتی ہیں اس لئے میں اب ان دو گروپوں کے ساتھ کام نہیں کرونگا۔

اکبر IDPs کی مدد میں بھی پیش پیش رہے، وہ ایک اور زاویے سے IDPs کے صوابی پر اثرات کہ ایسے دیکھتے ہیں:

سوات کے لوگ بہت کھلے مزاج کے ہیں، ہماری خواتین تو الحمدللہ ایک حصار میں ہوتی ہیں جب ہم کہیں جاتے ہیں۔لیکن سوات کی عورتیں فیشن ایبل ہیں دوپٹہ گلے میں ڈالے اکیلی بازار میں گھومتی تھیں۔کتنی ہزار گاڑیاں صوابی میں آئی اور وہ رش ابھی تک نہیں ختم ہوا، یہاں بے شمار شادیاں ہوئیں جب IDPs آئے اور سب خوشی اور رضامندی سے ہوا کیونکہ ان لڑکیوں نے کبھی مشکل حالات دیکھے نہیں تھے اور یہاں کے لوگوں کی بھی خواہشیں پوری ہو گئی تھیں۔

اکبر نے سوارہ کے کیسز پہ بھی کام کیا، وہ بتاتے ہیں:

پشاور سے ایک فریق نے سوارہ لیا وہ لڑکی ذرا ذہنی معذور تھی جب دوسرے فریق کہ پتا چلا تو انھوں نے اسکی واپسی کی اور بدلے میں دوسری لڑکی ڈیمانڈ کی، ہمیں جب پتہ چلا تو ہم نے باقی دوستوں کے تعاون سے اس لڑکی کی ملاقات اور انٹرویو صوابی پریس کلب کے انچارج سے کروایا پھر پریس کانفرنس کروائی، تو ان لوگوں کو جب پتہ چلا تو وہ چار دن تک ہمارے پیچھے پھرتے رہے مارنے کے لئے لیکن انکو نام اور پتہ معلوم نہیں تھا اس لئے ہم محفوظ رہے۔

کبھی کبھی حالات کی غیر یقینی صورتحال مجھے پریشان کرتی ہے جیسے آجکل بڑھتی ہوئی مہنگائی اور ریگولر کسی کام کا نہ ہونا، سوچتا ہوں بچوں کا کیا ہوگا لیکن اللہ پر پورا بھروسہ ہے، وہ الحمدللہ ابھی بھی مدد کر رہا ہے اور پھر بھی کریگا۔

شاکر

کراچی کے ایک معروف علاقے سمن آباد میں چند مسلح افراد نے گھر میں گھس کر ایک خاندان کو نقدی اور گھریلو سامان سے محروم کر دیا۔ واقعہ رات دو بجے کے قریب انجینئر شاکر کے گھر پیش آیا تفصیلات کے مطابق ڈاکوؤں نے اہل خانہ کو یرغمال بنا کر سامان لوٹا، خاتون خانہ پر تشدد کیا انہیں اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا اور موقع سے فرار ہو گئے۔

کراچی کے حالات آئے روز بگڑتے جا رہے تھے، ڈکیتی، جنسی زیادتی، قتل و غارت اور چوری کی وارداتیں معمول بنتی جا رہی تھیں جبکہ انتظامیہ خاموش تماشائی بنی بیٹھی تھی، امن عامہ کی بحالی کے لیے پولیس کی کوششیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔

شاکر نے اس واقعے کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ زیادہ وقت گزارنا شروع کیا، انکی صدماتی کیفیات کو حوصلہ مندی سے سمجھا، انکی شخصیت میں تبدیلی سے Adjust کرنے کی کامیاب کوشش کی اور انھیں موقع فراہم کیا کہ وہ اس مسئلے سے اپنے طور پر نمٹ سکیں۔ بعد ازاں شاکر نے اپنی بیوی کو تشدد کے خلاف ایک فلاحی تنظیم سے وابستگی میں مدد فراہم کی اور ہر ممکنہ طور پر اس واقعے کے اثرات سے نکلنے میں انکا ساتھ دیا۔

انجینئر شاکر سے میری پہلی ملاقات انکی فرم کے دفتر میں ہوئی جو نہایت سادگی سے سجایا گیا تھا، دیواروں پر جدید ورک سٹیشن نصب کیے گئے تھے اور کمرے کے ایک کونے میں چائے اور کچھ خشک میوہ جات رکھے تھے۔ انھوں نے مجھے خوش آمدید کہنے کے بعد سیکرٹری کو فون پر بتایا کہ دو گھنٹے تک ان سے کوئی فون نہ ملوایا جائے، انھوں نے خود چائے بنائی اور مجھے بھی پیش کی۔ ہماری گفتگو شروع ہوئی تو شاکر نے اپنی زندگی کی کہانی کا آغاز پرانے وقتوں میں تحفظ کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا:

میرے والد ایک سرکاری ملازم تھے اور والدہ ٹیچر تھیں، انھوں نے ماسٹرز کیا ہوا تھا لیکن کچھ سال کام کرنے کے بعد وہ گھر میں ہی رہیں اور انھوں نے بچوں کو پالا۔ ہم دو بھائی اور ایک بہن ہیں، دونوں بہن بھائی مجھ سے عمر میں بڑے ہیں۔ ہمارے وقتوں میں شہر چھوٹے تھے اور ماحول بہت کھلا اور محفوظ تھا، بچے باہر نکلتے تھے تو ڈر اور خوف نہیں ہوتا تھا۔ ہم لوگ بھی سارا وقت گھر سے باہر رہے، گلیوں میں کھیلے، گلی ڈنڈا کھیلا اور چھکیوں میں بھی بیٹھے، کبھی یہ فکر نہیں ہوتی تھی کہ ڈرائیور ساتھ ہو یا کوئی گارڈ ہو یا کوئی دیکھ رہا ہو۔

بہت آزاد ماحول تھا اور ہر ایک طبقے کے ساتھ ملاقات ہوتی، چھوٹے بڑے مل کر کھیلتے اور کبھی کسی کو روکا نہیں گیا کہ ایسے کریں یا ایسے کریں۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ تشدد کا خوف جو ہمارے بچوں کے سر پہ سوار ہے وہ اس زمانے میں نہیں تھا۔

ہمارے والدین کے خاندان بہت بڑے بڑے تھے، دونوں کے پانچ چھ بہن بھائی تھے، تو کزنز بہت سے تھے اور انکے ساتھ بہت وقت گزارا، ٹرپ ول کیا، انکے گھروں میں بھی جا کر رہے، انکے ساتھ گرمیاں بھی گزاریں، انکے ساتھ ملنا ملانا بہت رہا تو یہ دو گروپس یعنی کزنز اور فیملی کے لوگ زیادہ تر ہمارے اردگرد رہے، یہ بنیادی سماجی گروپ تھا جسکے اندر میں پلا بڑھا۔ چونکہ ہم ایک ہی جگہ پر رہے تو وہیں کے گروپ کے ساتھ بیس پچیس سال گزارے۔ اسی طرح سکول کے سارے سال ایک ہی سکول میں گزارے۔ اس سے جو سوشل سرکل تھا وہ بہت مستقل رہا۔

اپنے مالی حالات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے اپنی تربیت میں وضع کیے گئے چند اہم پہلوؤں کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے کہا:

مالی حالات درمیانے سے بھی نیچے تھے اور بہت کفایت شعاری سے ہمیں پالا گیا لیکن پڑھائی اور محنت پر بہت زور دیا گیا، ہمیں یہ بھی کہا گیا کہ 'صاحبی' بُری چیز ہے اس سے بچو۔ مجھے یاد ہے کہ ہمیں باقاعدگی سے جھاڑو دیے جاتے کہ باہر گلی میں جھاڑو لگاؤ حالانکہ والد صاحب سرکاری افسر تھے لیکن وہ ہمیشہ اسکی تاکید کرتے تھے کہ اس میں کوئی بری بات نہیں اس سے تمھاری نظر میں جسمانی کام کے بارے میں بُرے احساسات ختم ہوں گے مثلاً یہ بات تم میں پیدا ہو گی کہ جو جھاڑو لگاتا ہے وہ کوئی فرق آدمی نہیں ہے، تم صفائی کرو گے اور محسوس ہو گا کہ اس میں کوئی برائی نہیں ہے تو اس طرح سوشل طبقے کے لحاظ سے ہمیں شروع سے ہی بہت کھلا رکھا گیا تھا۔

یہ نہیں کہا گیا کہ ہم بہت اونچے لوگ ہیں اور باقی لوگ ہم سے فرق ہیں، والدہ کی طرف سے بھی یہی پیغام تھا کہ ہم کوئی بہت اونچی چیز نہیں ہیں کہ بہت ملازم ہیں ہمارے اور بڑا ہی کچھ ہے۔ بہت ہی low طریقے سے پالا گیا اور جو بنیادی values ہوتے ہیں، جیسے محنت، خلوص اور ہاتھ سے کام کرنا، مقابلہ کرنا میرٹ کی بنیاد پہ، ان پر بہت زور دیا گیا۔

بچپن سے ہی شاکر کے خاندان میں تحفظ کے حوالے سے احساس اجاگر کیا جاتا ہے، وہ کہتے ہیں:

مجھے یاد ہے جب آٹھ سال کا تھا تو ہمارا ڈرائیور تھا اس نے کہا مجھے کہ میں تمہیں لے کر جا رہا ہوں تو وہ جھگیوں میں لے گیا ساتھ اور ہمیں کچھ لوگوں کے ساتھ بٹھا دیا۔ کچھ باتیں کرنے کے بعد وہ چلا گیا اور پھر واپس نہیں آیا۔ تو بعد میں جب میں نے والدین کو بتایا تو وہ کہنے لگے کہ وہ تمہیں اغواء کرنا چاہتا تھا، آئندہ سے خیال کرنا ایسے لوگوں کے ساتھ مت جایا کرو۔

اسی طرح والدین کی غیر حاضری میں ایک واقعہ ہوا کہ ہم سب کھیل رہے تھے اور کھیلتے کھیلتے شام کا وقت ہو گیا، میری عمر اس وقت نو سال ہو گی، ہمارے گھر کی پیچھے جھگیاں تھیں، ہم وہاں چلے گئے اور گھومتے رہے، یہ خیال نہیں کیا کہ اندھیرا ہو گیا ہے، جب واپس آئے تو بہت زیادہ ڈانٹ پڑی کہ اندھیرا ہو گیا، تم کہاں غائب تھے۔ ہمیں کھیل کھیل میں احساس ہی نہیں ہوا کہ دیر ہو گئی ہے اور لوگ پریشان ہو رہے ہونگے، ہمارے والد صاحب بہت مضبوط آدمی تھے لیکن کبھی ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے بس انکی ایک آنکھ دیکھ کر جھاڑ پڑنا کافی ہوتا تھا، ہم ویسے ہی بھاگ جاتے تھے لیکن ہماری فیملی میں جسمانی اذیت دینا بہت ہی کم تھا۔

جس گھر میں ہم رہ رہے تھے وہ بہت پرانا تھا، ہمارا اپنا نہیں تھا بس اسکے اندر گزارا کرتے رہے، اسکی چھتیں گرتی رہتی تھی تو ہم لوگ بچ کر رہتے تھے۔ رات کو لیٹے سوچتے رہتے تھے کہ چھت کا کوئی حصہ پلستر وغیرہ ٹوٹ کر گر نہ جائے۔ ایک بار میری بہن کے بستر پر گرا لیکن وہ بچ گئیں تب میں بہت چھوٹا تھا، اسی طرح والد کے بستر پر گرا لیکن وہ اس وقت tour پر گئے ہوئے تھے انکا بستر بالکل ختم ہو گیا۔ بجلی اور پنکھے زیادہ نہیں تھے، ہم لوگ برآمدے میں مچھر دانیاں لگا کر بستر ڈال دیتے تھے اور اس پر گزارہ کر لیتے تھے۔ ایک ہی entertainment ریڈیو ہوتا تھا، رات کو کھانا کھانے کے بعد ہم بیٹھ کر ڈرامہ سُن لیتے تھے۔

شاکر اپنے زمانے کا آج کے حالات سے مستقل موازنہ کرتے نظر آتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

تھوڑے بڑے ہوئے تو موٹر سائیکل آ گئی، اسکی وجہ سے mobility تھوڑی زیادہ ہو گئی۔ گھومنے پھرنے لگے لیکن اس زمانے میں بھی safety بہتر تھی کہ ہم رات کو موٹر سائیکلوں پہ ایک، دو بجے تک گھومتے تھے، کبھی خطرہ محسوس نہیں کیا کہ کوئی گولی چلا دے گا یا لوٹ لے گا بلکہ ہم الٹا بہت زیادہ 'لٹنگ' رہتے تھے۔ ہوٹلوں پہ بیٹھ کے کبھی لیٹ شو دیکھتے تو کبھی

گھومنے نکل جاتے، کسی دوست کے پاس گاڑی ہوتی تو اسکے ساتھ بیٹھ کے کافی دور چلے جاتے چائے پینے۔ باہر کا جو ماحول تھا اسکا بڑا positive influence تھا، فیملی کا بھی تھا لیکن آج کل جو باہر کے حالات ہیں معاشرے کے، یہاں بچوں کو وہ آزادی نہیں مل رہی جو ملنی چاہیے، انکو بہت جکڑ کر رکھا جا رہا ہے ہر لیول پہ اور میڈیا سے بھی جو input آرہا ہے وہ بھی تشدد والا اور ڈرانے والا ہے جس سے خوف مزید بڑھ رہا ہے۔ اس وقت تو چلتے چلتے کسی سے مذاق بھی کر لیتے تھے اب ہم اپنے بچوں کو گلی میں نہیں جانے دیتے، موبائل فون انکی جیب میں ہوتا ہے اور ہم کہتے ہیں بتاؤ تم کہاں ہو، کیا کر رہے ہو، اُس زمانے میں کوئی پوچھتا نہیں تھا۔

شاکر کی زندگی کا ایک اہم سنگِ میل انکا انجینئرنگ میں داخلہ تھا جس پر والد سے انکا ہلکا سا اختلاف بھی رہا، وہ کہتے ہیں:

F.Sc کے بعد میرا انجینئرنگ کالج میں داخلہ ہوگیا، میں بہت خوش تھا کہ بارہ سال سے جس کام کے لئے لگا ہوا تھا وہ ہوگیا، اس وقت میرے والد اتنے زیادہ خوش نہیں تھے۔ کہنے لگے انجینئر بنو گے تو بھوکے مرو گے کیونکہ یا تو تم اتنے کامیاب ہوجاؤ گے کہ تمہیں کھانا کھانے کا ٹائم نہیں ملے گا یا تم اچھے نہیں بنو گے اور کام نہیں ملے گا تمہیں، پیسے نہیں کماؤ گے تب بھی بھوکے مرو گے۔ وہ چاہتے تھے میں ڈاکٹر بنوں لیکن میرا اس طرف بالکل رجحان نہیں تھا اور ویسے بھی وہ بہت زیادہ پُر جوش آدمی نہیں تھے، تھوڑے سخت دماغ کے بندے تھے، کچھ لوگ خوش ہوجاتے ہیں، آپکو گلے لگا لیتے ہیں لیکن وہ ایسے موقعوں پر بھی کوئی سخت بات کر دیتے تھے۔

اپنے کالج کے تجربات بیان کرتے ہوئے شاکر نے دیہی اور شہری علاقوں کا ایک دلچسپ موازنہ پیش کیا، وہ کہتے ہیں:

کالج میں پورے پاکستان سے لوگ آئے ہوئے تھے، کچھ rural علاقوں سے تھے اور کچھ urban سے، دونوں میں فرق تھا، ایک تو کلچرل difference تھا۔ ہم لوگ جو شہر میں پلے بڑھے تھے۔ ہمارا فلمیں دیکھنے کا شوق تھا، گھومنے پھرنے کا شوق تھا حالانکہ ہم بھی بڑے بڑے ہوٹلوں میں کھانے کھانے، چائے پینے جاتے تھے اور دوسرا یہ تھا کہ ہمارا co-educational institute تھا تو ہم لوگ خواتین سے بھی باتیں کر لیتے تھے، وہ زیادہ reserved رہتے تھے۔ وہ اپنی زیادہ entertainment ہاسٹل کے کمروں میں کرتے تھے۔ ہم لوگ باہر جا کے زیادہ گھومتے پھرتے تھے۔ وہ movies پر بھی جاتے تو اس زمانے میں پنجابی فلمیں بڑی پاپولر تھیں وہ دیکھتے تھے۔ ان کی entertainment ہم سے ذرا فرق تھی۔ دوسرا یہ تھا کہ یہ وہ زمانہ تھا کہ بھٹو صاحب بھی بڑے فارم میں تھے تو پولیٹیکل Movement بہت زیادہ شروع ہو رہی تھی، ان لڑکوں نے ایک political tree بنا لیا تھا جس طرح بلوچ سٹوڈنٹ فنڈ وغیرہ ہوتے تھے، کراچی کے انجینئرز نے الگ گروپ بنایا تھا اور پنجاب کے الگ تھے۔ یہ سب پولیٹیکل گروپنگ تھی۔ ان rural background کے لڑکوں کے پولیٹیکل ایجنڈے میں بھی تھوڑا فرق تھا تو وہ بھی ایک difference رہتا تھا۔ جب politically turmoil آیا اور یہ academically ذرا کمزور تھے۔ تو انھوں نے بہت زیادہ پھر push کیا کہ exam کے رزلٹ ٹھیک نہیں ہیں، انکو postpone کیا جائے اور جب تک supplementary exams نہیں ہونگے، اگلی کلاس کو نہیں چلنے دیا جائے گا تو یہ اس طرح کے کاموں میں بہت لگے رہتے تھے۔ ہم لوگ کیونکہ میرٹ پہ آئے ہوئے تھے یہ لوگ زیادہ تر backward areas کی

سیٹوں پر ہوتے تھے تو انکو compete ایک ہی لیول پر کرنا پڑتا تھا وہ انکو زیادہ مشکل لگتا تھا حالانکہ دوستیاں بھی تھیں لیکن آخر تک وہ کافی الگ الگ tracks پر چل رہے تھے۔ انکو resentment رہتی تھی نہ وہ خود پڑھتے تھے نہ ہمیں پڑھنے دیتے تھے۔ داداگیری کرنے آجاتے تھے۔ کئی ان میں سے weapon بھی استعمال کرتے تھے کیمپس میں، ہاسٹل میں رہنے کی وجہ سے تھوڑا protected بھی تھے، تو ہماری انکے ساتھ دشمنی بھی نہیں تھی اور دوستی بھی نہیں تھی، سلام دعا تھی اور ملتے ملاتے تھے لیکن closeness نہ تھی اور کبھی ان لوگوں پر غصہ بھی بہت آتا تھا۔

مجھے یقین ہے کہ انکے گروپ میں ہم discuss ہوتے ہونگے بڑا negatively کہ یہ تو شہری بابو ہیں پتہ نہیں یہ کیسے ہیں، اپنے آپکو کیا سمجھتے ہیں، ہمارے جوکر کے ذرا تیز تھے وہ انکا کافی مذاق اڑایا کرتے تھے (قہقہہ۔۔۔)، مجھے یاد ہے ان میں سے ایک لڑکے نے عینک خریدی جو عام سڑکوں پر بکتی ہیں، اسکی ایک glass پر جو سٹیکر لگا ہوتا ہے، وہ کوئی چھ ماہ تک لگا رہا (قہقہہ۔۔۔)۔ تو اسی طرح کی چیزیں انکے ساتھ ہوتی تھیں۔

ہم دوستوں نے سوچا کہ ملکر ایک ایسا گروپ بنائیں جو non-political ہو اور صرف اچھے کام کرے جیسے سٹوڈنٹ کی مدد وغیرہ، ہم نے چندہ کیا، کچھ دوائیں خریدیں سٹوڈنٹ کے لئے، پھر کچھ notes publish کروائے اور سٹوڈنٹ میں تقسیم کئے، پھر ایک میگزین چھاپا جس میں کوشش کی کہ لوگ آرٹیکل contribute کریں۔ وہ گروپ چلتا رہا اور جب ہم نے graduate کیا تو نئے لوگوں کو دے دیا گیا۔

کالج سے فراغت کے بعد ملکی اور گھریلو حالات کا تذکرہ شاکر نے یوں کیا:

اُس وقت پاکستان میں بہت turmoil تھا، اسی طرح خاندان میں بھی کچھ tensions تھیں، میرے بڑے بھائی باہر سے پڑھ کر آئے تھے اور کچھ مسائل اپنے ساتھ لائے تھے جسکی وجہ سے خاندان میں تناؤ چل رہا تھا تو بندہ کہتا تھا کسی طرح بھاگے، جان چھڑائے۔ کالج کی فیس پچاس روپے تھی، پانچ، چھ روپے کا پٹرول موٹر سائیکل میں پڑ جاتا تھا تو میں سوچتا تھا کہ کسی طرح جلدی پڑھائی کو ختم کر کے نکل جاؤں یہاں سے۔

میرے بڑے بھائی بہت زیادہ physically violent قسم کے بندے تھے، انکا یہ pattern ساری زندگی رہا، پوری فیملی میں مشہور تھا کہ انکا غصہ بہت تیز ہے اور وہ بڑے dangerous ہیں۔ وہ دوسروں پہ ہاتھ اٹھاتے، نوکروں پہ ہاتھ اٹھاتے تھے، ہر ایک پہ اٹھاتے تھے اور انکے غصے کا pattern زبانی بھی تھا اور جسمانی بھی تھا تو He was a stand off figure۔ باہر سے پڑھ کر آنے کے بعد انھوں نے نوکری شروع کر دی، بہت اچھی نوکری مل گئی تھی انہیں، پھر اُن کی شادی arrange کروائی گئی، فیملی بہت اچھی تھی لیکن خاتون کی کچھ بنی نہیں اور پھر وہ دو تین مہینے میں چھوڑ کر چلی گئی تو میرے والد کو وہ چیز بہت چبھی، انہیں نے بہت پریشر ڈالا والدہ پر کہ اس آدمی کی حرکتیں ٹھیک نہیں ہیں، اسے کہو ٹھیک کرے، والدہ بیچ میں پھنس گئی کیونکہ وہ اپنے بیٹے کو protect کر رہی تھیں۔ conflict بڑھتے بڑھتے بہت worst صورت اختیار کر گیا، ایک طرف والد تھے سخت دماغ لیکن principled اور دوسری طرف بھائی تھے جس کے لئے principle نام کی کوئی چیز نہیں تھی، وہ اپنی دنیا میں رہتے تھے، شادی ٹوٹ گئی اور طلاق ہوگئی، اسکے بعد والد نے کہا کہ یا تو یہ گھر سے نکلے گا یا میں نکلوں گا تو والدہ نے کہا کہ یہ تو نہیں جا سکتا which she indirectly meant کہ آپ جائیں، وہ بھی انکی شرافت تھی کہ وہ گھر خود چھوڑ کے چلے گئے۔ والدہ کو اور بچوں کو وہاں چھوڑ کر، انہیں نے جا کے کرائے پر جگہ لے لی اور اکیلے وہاں جا کے رہنا شروع ہوگئے۔

میں اس وقت کالج کے آخری زمانے میں تھا، وہ وقت بہت مشکل تھا۔ میں نے سوچا کہ والد کے جانے کے بعد resolution آ گیا ہے لیکن وہ conflict چلتا رہا، بھائی کی بعد میں شادی ہوگئی تب تک والد کو heart attack ہو چکا تھا، ہمارا ماننا ان سے بہت کم ہو گیا لیکن میں اور میری بہن ان سے باقاعدگی سے ملتے رہے، میرا بھائی ہمیشہ کہتا تھا کہ یہ غدار ہے جا کے ملتا ہے، والد نے اپنے اصول نہ توڑے اور relationship کو نہیں چلا سکے۔

میرے نزدیک اگر کسی کے بڑے اصول ہیں جبکہ وہ human relationship کو اہمیت نہیں دیتا تو ultimately اسکی زندگی کامیاب نہیں ہوتی I think human relationships are very valuable, اصول اپنی جگہ ہیں لیکن اگر کوئی اپنے قریبی لوگوں کو نہیں چلا سکتا ہے تو وہ اصول تو دور کے لوگ دیکھتے ہیں قریب کے لوگ اتنا نہیں دیکھ پاتے، میرے والد بھی اس معاملے میں ناکام رہے، وہ زیادہ بیمار رہنے لگے اور بعد میں انکا انتقال ہو گیا، میں اس وقت بیرونِ ملک تھا، ٹائم پر پہنچ گیا تھا لیکن وہ بہت بیمار تھے، مجھے لگا کہ زندگی کا ایک حصہ نکل گیا ہے اور میں یہاں نہیں تھا حالانکہ یہ بھی سمجھ تھی کہ حالات بہت مشکل تھے لیکن ایک، ایک جو unfinished business کا احساس ساتھ رہا۔

اپنے بیرونِ ملک سفر اور وہاں کی ابتدائی زندگی کی مشکلات کے بارے میں شاکر نے بیان کیا کہ:

گریجویشن کے چار مہینے بعد امریکا چلا گیا، وہاں چھوٹی موٹی jobs کیں، کسی سٹور پر نوکری کر لی یا odd jobs کرنی پڑیں تو کیں، mop لگایا کہ چلو کھانا تو میز پر آئے گا، پھر ٹریننگز تلاش کیں اور لے لیں، وہاں ٹریننگ کافی challenging تھی، working hours بڑے لمبے ہو جاتے تھے کبھی چھتیس چھتیس گھنٹے کی شفٹ ہم لوگ نان سٹاپ کرتے تھے اور weekends پہ بھی ہمیں کام کرنا پڑتا تھا تو off time ہوتا نہیں تھا، پھر آہستہ آہستہ ٹریننگ میں آگے بڑھتے گئے تو حالات بہتر ہوتے گئے، بہت reading ہوتی تھی، بہت پڑھنا ہوتا تھا، صبح سے لے کر شام تک hands-on کام بہت ہوتا ہے۔

شادی کے بعد شاکر کی زندگی میں کچھ تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جن کا تذکرہ انھوں نے یوں کیا:

میری شادی پچیس سال کی عمر میں ہوئی تھی اور ہم شادی کے بعد migration کروا کر امریکا شفٹ ہو گئے۔ شروع میں میں بہت سوچتا تھا کہ بہت مشکل ہوگی اور بہت discrimination ہوگی، مواقع نہیں دیے جاہیں گے لیکن دو تین سال کے بعد آہستہ آہستہ یہ یقین آیا کہ پابندیاں ہیں، discriminations ہیں لیکن پھر بھی بہت مواقع ہیں growth کے اور اتنی بھی مشکلات نہیں ہوتی ہیں کہ آپ بالکل ہمت ہار جائیں۔ ہمارے ٹیچر تھے پروفیسر تھے انکی personality بڑی nurturing تھی، انھوں نے ہمیشہ یہ reinforce کیا کہ تم کام اچھا کرتے ہو تمہیں ہم یہ مواقع دینگے، میں نے جب بھی باہر نوکری کے لئے apply کیا تو انھوں نے بہت اچھے خط لکھ کے دیے، ان hopes کو اٹھانے کے لئے انکا جو supportive role تھا وہ بہت اہم رہا، انکی مدد میری expectations سے زیادہ رہی، دل سے انھوں نے سپورٹ کیا۔ ان میں سے کچھ کالے تھے دو، تین، باقی گورے تھے، عیسائی بھی تھے، یہودی بھی تھے، میں نے دیکھا کہ وہ discriminations کرنے کے لئے چمڑی کے رنگ اور religion کا اتنا استعمال نہیں کرتے تھے۔ اگر کرتے تو نظر نہیں آتا تھا، اگر کسی کا کام اچھا ہوتا تو سپورٹ دیتے، یہ نہیں کرتے تھے کہ یہ مسلمان ہے، پاکستانی ہے یا تیسری دنیا کا ہے اسکو ایک طرف کر دیتے ہیں۔

ہمارا تین سال کا ٹریننگ پروگرام تھا، اسکے آخری سال میں ایک انجینئر کو چنا جاتا تھا جو ساری ٹیم کو lead کرتا تھا، کیونکہ اس میں بہت سے گورے بھی تھے، یورپین بھی تھے تو یہ خیال تھا کہ یہ لوگ گوروں کے علاوہ کسی کو نہیں دینگے لیکن جب سلیکشن کا ٹائم آیا تو انھوں نے مجھے nominate کیا، پھر میں ان کی بہت high level commitee میں بھی بیٹھتا رہا۔ اُس سے مجھے یہ feeling ہوئی کہ وہ لوگ کام کی بنیاد پر سلیکشن کرتے ہیں اور discrimination نہیں کرتے۔

US Systems اوپر نیچے کو بہت minimize کر دیتے ہیں، ہمیں ایک عادت ہوتی ہے کہ ہم کوئی بڑا ڈاکٹر یا ٹیچر ہے اسکو 'سر' کہتے ہیں، نام سے پکارنا تو مشکل ہوتا ہے۔ امریکا میں کسی پروفیسر کو 'سر' کہہ کر بلانا اُسے بہت proud کرنے کے برابر تھا، ہم اپنے اُستاد سینیئر انجینئر کو ہمیشہ first name سے کال کرتے تھے کہ جی Hello, John how are you۔

یہ نہیں کرتے تھے کہ (جھک کے) ہیلو صاحب، سر جناب السلام وعلیکم، تو اس طرح وُہ برابری کو promote کرتے۔

ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد تھوڑا سا کام کا پریشر کم ہو گیا، چھوٹی سی اپنی انجینیرنگ فرم بنائی تو اس میں اتنا time pressure نہیں تھا لیکن اکیلا پن زیادہ ہو جاتا کیونکہ جب ٹریننگ میں ہوتے تو بہت سے لوگ ساتھ ہوتے جو سپورٹ کر رہے ہوتے تھے، اپنے کام میں ذمہ داری آپ پر آجاتی ہے، اپنے ڈیپارٹمنٹ وغیرہ کو سنبھالنا ہوتا ہے، لوگوں کو چلانا ہوتا ہے۔

یہاں کام کی نوعیت اس طرح تھی کہ فالتو وقت بہت کم ملتا اور ایک مختلف کلچر میں ہوتے ہوئے ہمارے پرانے cultural guideposts نہیں تھے کہ انکو ملنا ہے، یہ کزنز ہیں، دوست ہیں، فیملی فرینڈ ہیں۔ اب ہم ایک الگ ملک میں تھے، وہاں پہ ہم نے ایک secondary social circle بنایا۔ اس کی activity level بھی مختلف تھے، family-oriented activities وہاں زیادہ ہوتی تھیں کہ آپ فیملی کے ساتھ ٹائم زیادہ گزارتے تھے، ڈائریکٹ فیملی کے ساتھ rather than کہ آپ اپنے چچاؤں، ماموں کو ملنے جانا ہے تو وہ there was much more nuclear family life اور کام کے اوقات بھی زیادہ ہوتے تھے، جب ہمیں ٹائم ملتا تھا تو ہم شکر کرتے تھے کہ فیملی کے ساتھ بیٹھنے کا موقع ملا ہے۔

عمومی لحاظ سے وہاں کے ماحول میں کام پہ زیادہ focus تھا تو محسوس ہوتا تھا کہ اگر کام میں کوئی نہیں focus کرے گا تو اسکے لئے بہت مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں یعنی work ethics کی improvment ہوتی، دوسرا وہاں پہ encouragement زیادہ تھی جسکی وجہ سے personal growth بہت ملتی تھی اور تیسری جو چیز تھی وہاں کا security کا ماحول، مجھے شروع میں بڑا عجیب لگتا تھا کہ اگر آپ گھر میں بھی رہتے تو آپکے گھر کے اردگرد دیواریں نہیں تھیں، ایک شخص سڑک سے چل کر آپکی کھڑکی تک آ سکتا تھا اور وہاں grilling بھی نہیں تھی شاید وہ شیشہ توڑ کر ہاتھ اندر ڈال کر کھول کے آجاتا۔ ہمیں جنوبی ایشیا میں رہتے ہوئے ایک چار دیواری کا concept رہتا ہے، باہر ایک گیٹ ہوگا جس پہ security ہوگی۔ اسکے بعد اندر کا گھر ہوگا اس میں grills ہونگی تو تقریباً ایک جیل سا ماحول ذہن میں آتا ہے، وہ وہاں پہ نہیں تھا، آپکو sense of personal security بہت ہوتی تھی، وہ بہت بڑا فرق تھا،

اس سے آپکا tension کا لیول کم ہو جاتا اور آپ بڑے آرام سے اِدھر اُدھر گھومتے تھے، عورتیں بھی رات کو اکیلے گھوم سکتی تھیں۔

شاکر اپنی پیشہ ورانہ تعلیم مکمل کرنے اور کچھ عرصہ تک امریکہ میں مقیم رہنے کے بعد اپنے تمام اثاثے بیچ کر پاکستان منتقل ہو گئے، یہاں انھیں فرق حالات کا سامنا ہوا، اپنے تجربات کے بارے میں وہ کہتے ہیں:

USA سے آنے کے بعد ہم کراچی رہے، وہاں کے حالات ان دنوں بہت خراب تھے، لوگ بندوقیں لے کر گھروں میں گھس آتے تھے۔ ہم لوگ سوچتے تھے کہ ہمارے گھر ایسا کچھ نہیں ہے کہ یہاں بھی کوئی ڈاکہ مارے، نہ جیولری ہے نہ پیسہ ہے نہ کچھ اور ہے۔ ہمارے ساتھ نہیں ہوگا لیکن جب ہوا تو میں نے realize کیا کہ ہم بھی vulnerable ہیں اگر ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے دروازوں پر تالے ہیں تو تالے توڑے بھی جا سکتے ہیں۔

ایک دن چند لوگ بندوقیں لیکر ہمارے گھر گھس آئے، گھر یلو سامان اور نقدی لوٹ کر مجھے ایک کمرے میں بند کر دیا، انھوں نے میری بیوی پر بہت تشدد کیا، انھیں زیادتی کا نشانہ بنایا اور فرار ہو گئے۔ جب یہ واقعہ ہوا تو اس کے بعد ہم لوگ ہمیشہ electronic alarm اور گارڈ کے ساتھ رہے ہیں کیونکہ آپکو یہ احساس ہوتا ہے کہ آپکا گھر vulnerable ہے کسی بھی وقت۔ کسی بھی ٹائم کوئی بھی داخل ہو سکتا ہے اور جب آپ کے سر پر کوئی بندوق رکھتا ہے تو آپکا طاقت کا equation ایک دم سے تبدیل ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر جب آپ نے نہ کبھی بندوق رکھی ہو نہ ہینڈل کی ہو تو ایک چیز یہ ہے کہ جب وہ واقعہ ہوا، اُس کے بعد یہ feeling آئی کہ I have to defend myself، جسکی کبھی ہمیں پہلے ضرورت نہیں پڑی تھی۔ کبھی میں نے محسوس نہیں کیا تھا کہ میں اسلحہ استعمال کروں یا مجھے اسکی معلومات ہونی چاہئیں یا گارڈز ہونے چاہئیں۔ اس کے بعد میں نے دو چیزیں سیکھیں ایک اگر آپ اپنے آپ کو Convince کرتے ہیں کہ جی میرے ساتھ یہ نہیں ہو سکتا جو کسی اور کے ساتھ ہوا ہے that is not true، اُسکے ساتھ جو ہوا ہے وہ آپکے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔

ہم نے اس واقعہ کو ایک ڈیکیتی کے طور پر ہی اپنے جاننے والوں سے شیئر کیا زیادہ تر لوگ کچھ خاص Supportive نہیں تھے I think تھوڑے بہت جو لوگ Activist قسم کے تھے اُنھوں نے Supportive کردار ادا کیا سب نے کہا جو ہو گیا سو ہو گیا بھول جاؤ اس کو یہ تو معاشرہ ایسا ہے یہاں کے حالات ہی ایسے ہیں لوگ مر رہے ہیں تو آپ کیوں اس کی اتنی Tension لے رہے ہو لیکن لوگوں کا یہ کہنا بھی تھا۔ کہ یہ ہو گیا ہے You are to get on with it ہم نے پولیس میں رپورٹ درج نہیں کروائی کیونکہ لوگوں نے کہا کہ پولیس کرتی تو کچھ ہے نہیں آئے دن ایسے واقعات ہو رہے ہیں اُن کے پاس ہماری details چلی گئیں تو اور تنگ کریں گے۔

ہم نے اکٹھے وقت گزرانا شروع کیا میں نے اپنی Wife کو سُنا اور انکے احساسات کو سمجھنے کی کوشش کی، جس تکلیف سے وہ گزر رہی تھی اس نے انہیں ایک نئی شخصیت کا روپ دے دیا تھا۔

میں نے پوچھا اس واقعہ کے فوراً بعد آپ نے کیا کیا؟

شاکر: کچھ بھی نہیں۔

میں نے بھی پوچھا Nothing?

شاکر: essentially nothing کیونکہ اس وقت کراچی کے حالات ایسے تھے لوگ کہتے تھے کہ کچھ فائدہ نہیں اسکے بعد شاکر نے اپنی کہانی جاری رکھی اور کہا:

میں نے moral اور psychological سپورٹ دی۔ کچھ سالوں تک اس سے اس طرح نمٹنے کی کوشش کی کہ we have to move on with life اس طرح کی situation سے نمٹنے کا ہر ایک کا اپنا طریقہ ہوتا ہے مجھے احساس ہوا کہ میری بیوی کا اتنا comfort level نہیں تھا کہ اس کو بھول جاتیں اور چھوڑ دیتیں۔ ان کی feeling تھی کہ اس ایشو کو اٹھایا جائے اور لوگوں سے اس پر بات کی جائے۔ اور بھی واقعات ہو رہے ہوں گے تو اگر سب لوگ چپ ہیں تو یہ مسئلہ کیسے حل ہوگا اس کی خاموشی توڑنی چاہیے۔ مزید گروپس کو دیکھا جائے جو اس مسئلے سے نمٹ رہے ہیں اور ان کو سپورٹ کیا جائے۔ تب مجھے لگا کہ اس ایشو کو Differently ڈیل کرنا چاہیے، اسطرح میری سمجھ بدلی اور میں نے اُن کو ہر لیول پر سپورٹ کیا، بیوی نے اسے آگے چلایا اس کو مختلف طریقوں سے Highlight کیا آگے چل کر ہم نے ایک organization کو join کیا جو تشدد کے مسئلے پر کام کرتی تھی۔ یہ ہماری زندگی کا بڑا اہم موڑ تھا، میں نے اُس organization کی مینجمنٹ میں اور financial procedures کو بہتر کرنے میں بہت مدد کی، کیونکہ یہ میری بیوی کا venture تھا اور اسکو وہ بہت اہمیت دیتی تھیں، سو میں نے بھی اس میں اپنا volunteer input کافی حد تک ڈالا۔

تشدد کے اس واقعے کے بعد بھی دو دفعہ روڈ پر مجھے گن پوائنٹ پر لوٹ لیا گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کے ہم صرف گھر پر ہی غیر محفوظ نہیں بلکہ باہر روڈ پر بھی ہیں۔ level of preparedness کو بڑھا دیا گیا۔ تاکہ ہماری vulnerability کم ہو جائے، آنے جانے میں احتیاط شروع کر دی۔ اپنا آنے جانے کا راستہ تبدیل کر دیا۔ I had never used the weapon, i have been pacifist لیکن یہ تو پہلے کی بات تھی۔ اب میں active ہو گیا ہوں۔ میں weapon چلانا نہیں جانتا تھا۔ اب میں loaded gun گاڑی میں رکھتا ہوں میں نے learn کیا کہ خود کو vulnerable condition میں نہیں چھوڑوں گا۔ اور اگر کسی نے اب حملہ کیا اور مجھے موقع ملا تو میں بھی جواب دوں گا۔

اپنے دفتر میں جنسی طور پر ہراساں کرنے کے واقعات کو شاکر نے بہت سختی سے نمٹایا اور ان واقعات کی بنیاد پر ادارتی سطح پر پالیسی ترتیب دی۔

ابتداء میں میرے آفس کی ایک خاتون ہیں۔ کہنے لگیں کہ ایک ڈرائیور ہیں۔ جب کوئی خاتون باتھ روم جائے تو he tries to get in. پہلے بھی ہوا ہے کچھ نامناسب باتیں بھی کرتا ہے تو میں نے مینیجر سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ میں بات کروں گا اور پھر بات ٹال دی۔ ایک دن وہ خاتون میرے پاس بہت پریشان آئیں۔ مَیں نے یہ کیس پہلی دفعہ سنا تھا کہ اس پہ ایکشن نہیں لیا جا رہا۔ مَیں نے کہا کہ یہ بات تو صحیح نہیں ہے۔ بعد میں ہم نے تصدیق کے لیے 2-3 متاثرہ لڑکیوں کا انٹرویو کیا جس سے اُسکا جُرم ثابت ہو گیا، معلوم ہوا کہ وہ نامناسب باتیں کرتا ہے، یا باتھ روم میں گھسنے کی کوشش کرتا ہے تو میں نے کہا کہ یہ تو ہرگز قابلِ قبول نہیں ہے۔ اُس ڈرائیور کو فوراً نوکری سے نکال دیا گیا۔ اِس سے پھر female staff جو اس وقت بہت کم تھا انکو یہ محسوس ہوا کہ ہاں وہ اگر اس طرح کی بات کریں گی تو اس کو سنا

جائے گا۔اس کے بعد ہم نے اس پالیسی کو تھوڑا اور مضبوط کیا کہ اگر خواتین clients کے ساتھ بھی نامناسب رویہ ہوگا اس پہ بھی ہم ایکشن لیں گے لوگوں کو ہم نے بتادیا کہ یہ قابلِ قبول نہیں ہے ،اسکے بعد ہم نے formal sexual harassment policies in place کیں اور عورتوں اور مردوں کو ان کا role سمجھایا۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ خواتین کو جس حد تک ہو سکے یہ feeling نہ ہو کہ ہمارے ساتھ کچھ نامناسب ہوا تو ہم کچھ کر نہیں سکیں گی۔

بیرون ملک رہائش کے دوران شاکر نے ہر طرح کے حالات کا سامنا کیا، وہ وہاں کے نظام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

میرا ماننا ہے کہ مغرب یا امریکہ میں لوگوں کا کچھ چیزوں پر یقین ہے جیسے کہ honesty اچھی چیز ہے۔اس کو انہوں نے اپنے system کا حصہ بنایا ہے۔ان میں کئی ایسی باتیں ہیں جو ہمارے religion یا culture سے متصادم نہیں ہیں۔ہم صرف اس rebellion میں پڑے ہیں کہ یہ مغرب کی ہیں اس لیے ہم نہیں لیتے تو اس سے نقصان ہوتا ہے۔چائنہ اور جاپان کو دیکھیں وہ بھی تو باہر کی چیزیں لے کر آگے بڑھ رہے ہیں۔

ہم لوگ technicians پیدا کرتے ہیں لیکن ان کو humanities کی understanding نہیں ہے کہ سماجی لحاظ سے ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔اگر آپ دیکھیں امریکا میں undergraduate courses ہیں وہ کئی گھنٹے تاریخ اور فلسفہ کو دیتے ہیں جن کو ہم soft subject کہتے ہیں۔جو سماجی طور پر آپ کو آگے بڑھاتے ہیں چاہے آپ انجینئرنگ میں بھی جا رہے ہیں۔لیکن یہاں پہ ہم physics, chemistry, botony, zoology جو سائنسی مضامین ہیں ان پر زور دیتے ہیں technically اپنے آپ کو مضبوط کرتے ہیں کہ technical skills ہمیں آجائیں۔ہم لوگ technical knowledge پر بہت زور دیتے ہیں۔لیکن humanities کا جو aspect miss کر دیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہماری سوچ اتنی closed ہے۔

بچوں کی پرورش کے معاملے میں شاکر اور انکی بیوی نے ایک خاص نکتہ نظر رکھا، وہ کہتے ہیں:

میرے خیال میں بچے والدین سے impact لیتے ہیں، چونکہ ہم دونوں کا یہ خیال تھا کہ engineering ایک dry subject ہے، آپ اس میں کامیاب تو ہو سکتے ہو لیکن یہ آپ کو ایک اچھا شخص بننے میں مدد نہیں دے سکتا تو آپ بچوں کو consciously یا sub-consciously یہ سب pass through کرتے ہیں، ہم نے بچوں کو subject کی سیلیکشن میں نہیں روکا، انکو جو پسند آیا وہ انھوں نے کیا۔Traditional parents کی طرح نہیں تھا کہ صرف سائنس ہی لینی ہے، ہم نے انہیں کہا کہ دیکھو اگر تم اس میں خوش ہو، تم مطمئن ہو اور سمجھتے ہو کہ اسکو کر سکتے ہو تو کر لو۔ جب میں پڑھا رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ایسے بچوں کو جو زبردستی انجینئرنگ پڑھ رہے تھے، میرے آفس آ کر روتے تھے کہ ہم والدین کی وجہ سے آگئے ہیں ورنہ نہیں آنا چاہتے تھے، میں نے suicides تک دیکھیں، بچوں پر بہت زیادہ پریشر ہوتا تھا، ہم نے اس طرح کبھی پریشر نہیں ڈالا۔

بچوں کی تربیت میں ہم نے انھیں پاکستانی کلچر سے قریب کیا، امریکا سے آنے کے بعد لوگوں نے کہا کہ بیٹے کو امریکن سکول میں کروائیں اس نے آگے چل کر امریکا واپس چلے جانا ہے، ہم دونوں نے کہا کہ نہیں یہ لوکل سکول میں جائے گا ،لوکل سکول میں پڑھے گا حالانکہ شروع میں بہت رویا دھویا کہ مٹی بہت ہوتی ہے ڈیسک پر، انکی والدہ نے انکو جھاڑن دے دیا کہ بیٹھنے سے پہلے صاف کر لیا کرو اب پاکستان ہے اس میں مٹی تو ہوگی۔اور یہاں پر یہ چیز بچوں کو محسوس ہوتی

ہے کیونکہ وہ جگہیں اتنی صاف ہیں، اسی طرح ہم نے کوشش کی کہ وہ پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کریں، ویگنوں پر جائیں ،کبھی کوئی یہ feeling نہیں دی کہ ہم کوئی بہت Elite privileged class ہیں اور بہت پیسے ہیں، hard work کا کہا اور پیسے کا کنٹرول کیا، اسی لیا ہمارا بیٹا حالانکہ وہ امریکا رہ رہا ہے وہ آئے گا تو اسکو اگر کوئی چھوڑ دے تو وہ کھوکھے پر بیٹھ کر کھانا کھالے گا، لوگوں کے ساتھ اس کی گپ شپ ہو جائے گی اور وہ یہاں بہت comfortable ہوگا۔

بیٹی کی تربیت میں ہم نے تھوڑا فرق رکھا وہ یہ کہ ہمارے کلچر میں بیٹیوں کو زیادہ closely protected رکھتے ہیں، watch کرتے ہیں، بیٹوں کو بھی کرتے ہیں لیکن کچھ وقت کے بعد بیٹوں کو ہم ذرا زیادہ آزادی دے دیتے ہیں، بیٹیوں کو نسبتاً کم دیتے ہیں، جس طرح بیٹے کو ہم نے abroad بھیج دیا انیس سال کی عمر میں کہ جا کر پڑھو، بیٹی کو ہم اتنی آسانی سے نہیں بھیج سکتے، اسکی بڑی وجہ کلچر کے علاوہ یہ بھی ہے، کہ بیٹا اور بیٹی نے اسی ماحول میں آگے پیچھے ہو کے فٹ ہونا ہے، یہاں پہ ہو یا abroad ہو ان میں سے پاکستانی نکل نہیں سکتا۔ اگر ہم انکو اتنا فرق کر دینگے تو وہ امریکن ہی بن جائیں گے، we have to keep them with certain norms، تو صاف ظاہر ہے وہ فرق آتے ہیں، لیکن انکو ذہنی طور پر نہیں روکا گیا کہ آپ یہ نہیں پڑھ سکتے، یہ نہیں کر سکتے ہو، آپ بحث میں حصہ نہیں لے سکتے ہو، آپ چیزوں کو اٹھا نہیں سکتے ہو they can come and ask questions, discuss issues, وہ چیلنج کر سکتے ہیں کہ آپ اسکو اس طرح کیوں کرتے ہیں، and you have to be willing to justify اور آپکو ان کا جواب دینا ہی ہوتا ہے۔

شاکر معاشرے کی بہتری کے لئے فنون لطیفہ کی اہمیت کو تاریخی پس منظر میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مجھے بڑا عجیب لگتا ہے کہ ہم پاکستانی لوگ اپنے کلچر سے خوش بھی رہتے ہیں لیکن اسکے بارے میں complaint بھی بہت کرتے ہیں تو ایک love-hate relationship ہے پاکستان کے ساتھ، اپنے پاکستانی ہونے کو بہت زیادہ value کرتے ہیں، دل میں اسکو بہت زیادہ اہم سمجھتے ہیں لیکن اس پر کافی تنقید بھی کرتے ہیں، بہت دفعہ superficially بات کرتے رہتے ہیں نہ پڑھتے ہیں اس چیز کو نہ study کرتے ہیں، کوشش نہیں کرتے سیکھنے کی کہ دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں، مسائل کی وجوہات کو identify کر لیں تاکہ عملاً کوئی بہتری کی صورت ممکن ہو سکے۔ یورپین لوگوں نے اپنے آپکو بہت study کیا ہے اور بہت odds کے بعد اور بہت نقصانات کے بعد انکو سمجھ آئی کہ انکے کیا dynamics تھے جو ان پر اثر انداز ہوتے تھے، اپنے پرانے دور میں بھی جب وہ جنگیں لڑتے تھے تب بھی بہت لوگ ان میں تھے جو پڑھتے تھے اور اس issue کو discuss کرتے تھے اور اسکے لئے اپنی جانیں دے دیتے تھے لیکن انکے لئے یہ جاننا اہم تھا کہ انکی society کو کیا influence کر رہا ہے۔ہمیں بھی بہتر معاشرے کے لئے بچوں میں تاریخ اور آرٹس کو ترغیب دینی چاہیے تاکہ ہم بہتر انسان بن سکیں۔

ایک چیز جو مجھے کافی تنگ کرتی ہے وہ غیر یقینی صورتحال ہے یا جسے law and order کے حالات کہہ سکتے ہیں۔ غیر یقینی کی صورتحال آپ کے مستقبل کی منصوبہ سازی پر بہت اثر انداز ہوتی ہے اور آپ کچھ plan نہیں کر سکتے۔

شبیر احمد

جنوبی پنجاب کے شہر ڈیرہ غازی خان کے نواحی علاقے بیٹ علی سلطان سے پولیس نے ایک 16 سالہ لڑکی کو چند افراد کے قبضے سے بازیاب کرالیا۔ تفصیلات کے مطابق لڑکی کو 9 ماہ قبل بستی قائم دین گاؤں سے مقامی زمیندار کے کارندوں نے اغوا کیا تھا۔ انھوں نے اسے قریبی دیہی علاقے میں قید میں رکھا۔ اور اجتماعی زیادتی کا نشانہ بناتے رہے متاثرہ خاندان نے زمیندار کے خلاف FIR درج کروائی۔ جواباً لڑکی کے والد اور بھائی کو ایک جھوٹے مقدمے میں ملوث کر کے حراست میں دلوایا گیا۔ بعدازاں زمیندار نے مقدمے کو اس شرط پر واپس لیا کہ متاثرہ خاندان بھی اغوا کا پرچہ واپس لے۔

پنجاب کا یہ علاقہ بلوچستان سے ملحق ہے اور یہاں کے باسی نیم قبائلی طرزِ زندگی اپنائے ہُوئے ہیں۔ یہ کاشتکار لوگ اپنی بیٹی کے اس طرح اغوا ہو جانے پر شدید پریشان تھے۔ انہوں نے مدد کے لیے تگ و دو شروع کی اور مختلف سیاسی اور سماجی شخصیات سے رابطہ کیا۔ شبیر احمد علاقے کے ایک معروف سماجی و سیاسی کارکن ہیں، اس واقعے کا علم جب انہیں ہوا تو طاقتور قبیلے کے بااثر زمیندار کے ملوث ہونے کے باوجود انھوں نے متاثرہ خاندان کا ساتھ دیا۔ انھیں قانونی امداد بہم پہنچانے میں پیش پیش رہے۔ لڑکی کے والد اور بھائی کی ہر ممکنہ مدد کی، کیس واپس ہو جانے کے بعد جب متاثرہ خاندان نے دوبارہ اپنی بیٹی کی بازیابی کے لئے مقدمہ کرنا چاہا تو قانونی پیچیدگیوں کو سلجھانے کے لئے ہائی کورٹ تک رہنمائی کی ۔اپنے وکیل دوستوں کے ذریعے اس کیس کو میڈیا میں لائے اور پولیس پر دباؤ بڑھایا کہ وہ اس مسئلے میں انصاف سے کام لیتے ہوئے زمیندار کے خلاف کارروائی کرے۔

شبیر سے میری ملاقات ان کے آبائی گاؤں عالی والا میں ہوئی۔ وہ اپنے مہمان خانے پر گاؤں کے چند افراد کے ساتھ موجود تھے۔ یہ مہمان خانہ جسے علاقائی زبان میں ڈیرہ کہا جاتا ہے، رہائشی عمارت سے چند قدم کے فاصلے پر واقع تھا۔ اور دیکھنے میں روایتی زمیندار خاندان کی عکاسی کرتا تھا۔

شبیر نے گرمجوشی سے میرا استقبال کیا، بیٹھنے کو کہا اور دو افراد کو خاطر مدارات کے انتظام کے لیے روانہ کر دیا۔ شبیر سے میرا تعارف پہلے ہی فون پر ہو چکا تھا۔ ہم نے بات چیت کا آغاز میرے سفر کے احوال اور موسم کی غیر یقینی صورتحال سے کیا۔ بعدازاں ہماری گفتگو کا موضوع شبیر کی زندگی رہا۔ ابتدا میں شبیر نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا:

میں شبیر احمد ہوں۔۔ بلوچ قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں۔۔ ڈسٹرکٹ ڈیرہ غازی خان کے دیہاتی علاقے کا رہائشی ہوں، سماجی کارکن ہونے کے ناطے مختلف طریقوں سے اپنی خدمات سرانجام دے رہا ہوں۔ ہمارا خاندان اپنے علاقے کے اندر سپیریئر (superior) قسم کی پوزیشن پر تھا اور ہم نے اپنے بڑوں کو علاقے کے لوگوں کے مسائل کو حل کرتے دیکھا۔ یہ مسائل حقوق کے حوالے سے ہوں یا ترقی اور معاش کے حوالے سے، ہمارے بڑوں نے انھیں حل کرنے کی کوشش کی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہمارے اندر بھی یہ جذبات پروان چڑھتے رہے کہ ہم نے بھی اُسی روایت کو برقرار رکھنا ہے اور اپنے علاقے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا ہے۔

شبیر بچپن کے اہم واقعات کا ذکر کرتے ہوئے ان روایات کو بیان کرتے ہیں جن میں مہمان نوازی پر بہت

زور دیا گیا۔

مجھے یاد ہے کہ بچپن میں ہم سے کام لیا جاتا تھا۔۔۔ یہ ڈیرہ جہاں آج ہم بیٹھے ہیں، مہمانوں کے لیے ہوتا تھا جیسے آج بھی ہے، ہمیں کہا جاتا تھا جاؤ مہمانوں کے لیے انتظام کر دو۔ ہم وہاں کی صفائی ستھرائی کرتے، تازہ پانی بھر کر رکھتے، ہم پر زور دیا جاتا کہ سب کام ہم خود کریں یا اگر کوئی ملازم ہے تو اس کے ذریعے کام کی تسلی کروائیں۔ صُبح کی روٹین عام ہوتی تھی۔۔۔ تو صبح صبح گائے کے اُپلے سے اُس کو دھواں لگوا کر مہمانوں کے لیے تیار رکھنا ہوتا تھا یعنی کہ ہماری فیملی کے اندر تعلیم یہ تھی کہ مہمان آ جائے تو ہر حوالے سے اُس کا خیال رکھو۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ مہمان کو کسی ملازم کے ذریعے serve کرو۔ بلکہ اچھی بات یہ ہے کہ آپ اُن کو ہر چیز خود serve کرو، یہ نہ دیکھو کہ مہمان آپ سے بہتر ہے یا کمتر ہے اُس کو پانی پلاؤ اُس کو حقہ پیش کرو، کھانا کھلاؤ۔ کبھی کبھی ہم اسے بوجھ بھی محسوس کرتے تھے، رات گئے تک کام کرنا پڑتا حتیٰ کہ ایک آدھ دفعہ جھاڑو بھی خود دینا پڑا تھا کیونکہ گھر کے اندر تو خواتین فیملی ممبرز کر لیتیں ہیں لیکن باہر آنا جانا اُن کے لیے ممکن نہیں ہوتا تھا تو وہ سارا کام ہمیں کرنا ہوتا۔

معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے لیے چند اسباب ومحرکات کا ذکر کرتے ہوئے شبیر نے کہا:

بچپن میں جب مَیں لکھنا پڑھنا سیکھ رہا تھا تو مجھے یاد ہے مَیں نے اپنے نام کے ساتھ "خان" لکھا۔ بلوچوں میں خان کچھ زیادہ چلتا ہے تو میرے نانا جو ہمارے قبیلے کے مقدم (سردار) تھے، اکثر لوگوں کے جرگوں کے فیصلے بھی کرواتے تھے اُنہوں نے میرے نام کے ساتھ یہ لکھا ہوا دیکھا تو کہا کہ یہ تو آپ نے ٹھیک نہیں لکھا، اس طرح تو نہیں ہونا چاہیے یعنی اپنے آپ کو بندہ خان نہ لکھے اور نہ خود کو بڑا کہے بلکہ لوگ آپ کو بڑا تسلیم کریں۔ انہوں نے کہا کہ آپ اپنی تعلیم کو آگے بڑھاؤ اپنے اندر کوالیٹیز qualities پیدا کرو۔ اُنکی وہ بات میرے ذہن میں اب تک ہے۔ ابھی بھی لکھتے ہُوئے کبھی خان لکھا جاتا ہے تو فوراً وہی بات سامنے آ جاتی ہے۔

شبیر کو بچپن میں اپنے والد کی طرف سے ایک ناپسندیدہ قدم کا سامنا کرنا پڑا جس کے اثرات آج بھی اُن کے ساتھ ہیں، وہ کہتے ہیں:

والد صاحب ٹیچر تھے، میرے خیال میں میں چھ (6) یا سات (7) سال کی عمر میں تھا۔ تھوڑا تھوڑا یاد ہے کہ والد صاحب نے دوسری شادی کی تھی یعنی اس وقت بالکل بچپن تھا، یوں سمجھیں کہ سر مونڈاتے ہی اولے پڑ گئے تھے۔ ہم ٹوٹل تین بہن بھائی ہیں، دو سوتیلے ہیں۔ حالات کچھ اس طرح کے تھے کہ اُن کے ساتھ شروع ہی سے نہیں بن سکی اور اب بھی نہیں ہے، وہ الگ ہیں اور ہم الگ۔ مجھے لگتا ہے والد کے اس قدم کی وجہ سے ہم میں احساسِ محرومی پیدا ہوتا رہا ہے، اُن کی توجہ بٹ گئی تھی اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم زندگی میں کچھ اور آگے بڑھ جاتے جو ابھی ہم نہیں کر سکے۔

عمومی طور پر بچپن میں گھر کا ماحول لکھنے پڑھنے والا تھا۔ ہماری فیملی اپنے علاقے کی اس وقت کی سب سے پڑھی لکھی فیملی تھی۔

بلوچ روایات میں صنفی ترقی اور کلاس کی تفریق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شبیر کہتے ہیں:

جب سے میں نے ہوش سنبھالا ایسا سیٹ اپ دیکھا کہ خواتین اور مرد ہمیشہ علیحدہ ہوتے۔ گھر کے اندر اور دوسری فیملی یا برادری میں بھی خواتین کے ساتھ ملنا جلنا منع ہے۔ بالکل بچپن میں تو اکٹھے کھیلنا کودنا ممکن ہے لیکن اُس کے بعد جیسے عُمر بڑھتی جائے separation والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ میری تعلیمی زندگی میں بھی جہاں پڑھتا رہا۔ پرائمری،

مڈل، ہائی سکول اور اسی طرح کالج اور اُوپر، کہیں پر بھی کوایجوکیشن co-education نہیں تھی۔ جب میں نے عملی زندگی شروع کی اور باقاعدہ طور پر سوشل سیکٹر میں آیا۔۔۔تو یہاں فی میل کے ساتھ بھی میل جول ہوا، بات چیت ہوئی تو شروع میں بہت دقّت پیش آتی کیونکہ بات چیت کا تجربہ نہ ہونے کے باعث مجھے اُن کے ساتھ یوں سمجھیں کہ ایک ہچکچاہٹ رہتی تھی۔ شروع شروع میں یہ بھی سمجھ نہ آتی کہ ان کے ساتھ کس طرح سے بات چیت کی جائے یا آغاز کس طرح کیا جائے۔ اگر کسی میٹنگ میں خواتین سے بات کرنی پڑ جاتی تھی تو میں جھجھک محسوس کرتا لیکن پھر آہستہ آہستہ اعتماد بہتر ہونے کے ساتھ یہ جھجھک دور ہوتی چلی گئی۔

مَیں اپنے بچپن سے لے کر ابھی تک گانا بجانے کو تھوڑا معیوب سمجھتا رہا ہوں۔ مَیں سمجھتا ہوں یہ تو ایک میراثیوں والا کام ہے۔ بعض دفعہ ہماری کلاس میں کوئی بزمِ ادب ہوتی تھی تو سرائیکی میوزک کا مقابلہ ہوتا کوئی غزل سناتا تو کوئی گانا۔ ہر کوئی کچھ نہ کچھ سناتا لیکن میں کچھ نہیں سناتا تھا بعض اوقات اس بات پر سزا بھی ملتی تھی۔ میرے ذہن میں یہی پختہ ہوتا کہ میں تو ایک بلوچ قبیلے سے ہُوں اور یہ میری شان کے خلاف ہے اگر میں گانا بجانا شروع کردوں۔

ہم بڑوں سے سنتے تھے کہ ہماری فیملی سے کوئی ایک تھا جس کو میوزک میں دلچسپی تھی اپنے شوق کو پورا کرنے کے لیے اُس نے ہارمونیم یا جسے ہم 'پیٹی' کہتے ہیں وہ خرید لی۔ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور بچپن میں ہی اُس کے باپ کی وفات ہوگئی تھی جس کے بعد وہ کافی حد تک خود مختار ہوگیا تھا۔ وہ پروفیشنل لوگوں کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے 3-2 بلوچ دوستوں کے ساتھ مل کر ہی شوق پورا کرتا۔ وہ شخص آج بھی حیات ہے، اُس کو شوق پورا نہیں کرنے دیا گیا، ہمارے کسی بڑے نے ہارمونیم زبردستی اُٹھوایا اور یہ کہہ کر فروخت کروا دیا تھا کہ یہ میراثیوں والا کام ہے۔ بچپن سے ہم دیکھتے تھے کہ شادی بیاہ کے دوران سہرا گانا اور دوسرے فنکشنز (Functions) میں ہماری خواتین اور نہ ہی مرد جھومر وغیرہ کرتے بلکہ اُس دوران اُس خوشی کو دوبالا کرنے کے لیے جو میراثی مرد و خواتین آئے ہوئے ہوتے وہ کرتے۔ یہ سب دیکھ کر مَیں سوچتا ہمارا جھومر کرنا ٹھیک نہیں ہے اور کوشش کی ہے کہ یہ نہ کروں۔

شبیر نے اپنے سکول میں تشدد دیکھا اور وہاں پائی جانے والی سنّی شیعہ تقسیم کو یوں بیان کیا:

جب میں مڈل سکول میں تھا اور چھٹی (6th) ساتویں (7th) جماعت میں پڑھتا تھا۔۔۔تو اُس دوران کبھی کبھی ہم دوست سکول سے لیٹ ہو جاتے تھے۔ ایک دن PTI گیٹ پر کھڑا ہوگیا ہم پانچ یا دس طلباء تھے۔ سردیوں کا موسم تھا، اُس نے آتے ہی دو چار سٹکس (Sticks) لگا دیں اُس دن کے بعد یہ سوچ لیا کہ دوبارہ سکول سے لیٹ نہیں ہونا۔ سکول کے اُس دور میں ایک دفعہ اور مار پڑی تھی، تین بجے نماز کی بریک ہوتی تھی تو کچھ سٹوڈنٹس avoid کر جاتے تھے نماز نہیں پڑھتے تھے اور کچھ نماز پڑھتے تھے۔ ٹیچرز زور زبردستی بھی کرتے تھے کہ نماز پڑھا کرو۔ وہاں اکثریت لڑکے اہلِ سنّت کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کی تو باقاعدہ جماعت ہوتی تھی، باقی جو تعداد میں تھوڑے ہوتے تھے کبھی اپنے کلاس روم کے اندر نماز پڑھ لیتے یا پھر ساتھ والی کسی مسجد میں چلے جاتے۔ مَیں چونکہ اہلِ تشیع کے مسلک سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں باہر جا کر پڑھ لیتا تھا۔ سکول کی بلڈنگ کے پیچھے بہت بڑا گراؤنڈ تھا، جو لوگ نماز نہ پڑھتے وہ وہاں کھیل کود میں لگ جاتے تھے ایک دن وہاں پہ ہیڈ ماسٹر آ گئے۔ اُس نے سب کو پکڑ لیا، وہ پہلے اسمبلی میں بھی وارننگ دے چکا تھا کہ جب جماعت ہو رہی ہو تو جایا کرو، وہ بہت غصّے میں تھا، اُس دوران مجھ پر بہت زیادہ خوف طاری ہوگیا اور میں اُن کو بتا نہیں سکا کہ میں اہلِ تشیع میں سے ہوں اور باہر جا کر نماز پڑھ چکا ہوں، اُس نے سب کو مُرغا

بنا لیا تھا، بعد میں اُسے پتا چلا تو مجھے کہا کہ آپ کو مجھے بتا دینا چاہیے تھا تاکہ آپ سزا سے بچ جاتے۔

اپنی سیاسی وابستگی اور عملی تجربات کے حوالے سے شبیر نے کہا:

ہمارے ہاں سیاسی منظر یہ ہے کہ تمام علاقوں میں پیپلز پارٹی کا ووٹ زیادہ ہے کسی ان پڑھ کاشتکار سے بھی پوچھا جائے تو وہ بھٹو کا نام لے گا کیونکہ بھٹو نے وہاں پر زرعی اصلاحات کی تھیں اور بھٹو نے غریب کو زبان دی تھی۔ یہ اصل میں بھٹوازم کا جذبہ ہے جو آج بھی لوگوں میں موجود ہے۔

میرے بھائی اور والد بھی کسی نہ کسی حوالے سے سیاست سے وابستہ رہتے ہیں۔ وہ جس MPA کی حمایت کرتے ہیں وہ نظریاتی طور پر پیپلز پارٹی سے ہیں اور ابھی بھی MPA ہیں لیکن پچھلی حکومت میں ایک اور پارٹی سے منسلک تھے۔ انہی دنوں مجھے فون پر انہوں نے کہا کہ تحصیل میں ایک پارٹی کنونشن ہو رہا ہے جس میں میری خدمات recognize کی جائیں گی، آپ وہاں میرے نمائندے کے طور پر جاؤ۔ میں وہاں چلا گیا، پارٹی کے تقریباً سب لوگ وہاں آئے ہوئے تھے۔ اُس میں میرے جاننے والے بھی تھے۔ ان میں کچھ وکلاء کچھ فیوڈلز بھی تھے، وہاں 200-100 لوگ موجود تھے اور کئی ابھی تک آ رہے تھے۔ مَیں نے ایک جاننے والے کو کہا کہ میں MPA کے نمائندے کے طور پر آیا ہوں۔ اُس نے مجھے MPAs کے لیے مختص جگہ پر بھیج دیا۔ وہاں پر ہمارے ایک منسٹر بیٹھے تھے۔ میں نے اُس سے ہاتھ ملایا اور اپنا تعارف کرایا۔ اُس کو میرا نام پہلے ہی پتا تھا۔ ہماری فیوڈل کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی اُس وقت سے وہ ہمیں جانتے تھے۔ اُس نے اچھا پروٹوکول دیا، تھوڑی دیر بعد پارٹی کے انتخاب کا مرحلہ شروع ہوا، کئی MPA خود آئے تھے اور ایک دو کے نمائندگان آئے ہوئے تھے۔ مجھے لگا کہ پارٹی کے سربراہوں اور ہمارے مخالفین نے اس وقت تو قبول کر لیا لیکن میرا وہاں ہونا انہیں ناگوار گزرا۔ انہوں نے سوچا تھا کہ ہم تو اُن کو شروع سے ہی دباتے آ رہے ہیں۔ یہاں تک کیوں پہنچ گیا ہے یہ۔ اور یہ اب ہمارے برابر آ گیا ہے۔ پھر عام پبلک کے سامنے اعلانات شروع ہوئے کہ یہ فلاں فلاں عہدیدار منتخب ہوگئے ہیں ہر عہدیدار کھڑا ہوا تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے۔ اس میں میرا نام بھی شامل تھا۔

اس کے بعد سب مبارکباد دینے لگے۔ وہاں کھانے کا انتظام تھا لیکن میرا وہاں کھانا کھانے کا پروگرام نہیں تھا کیونکہ جو انتظام کر رہے تھے وہ دوسرا گروپ تھا اور MPA جس کی نمائندگی مَیں کر رہا تھا وہ اور گروپ تھا۔ مَیں وہاں سے نکل پڑا ابھی گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ فون آ گیا کہ میرے بڑے بھائی پر FIR ہوگئی ہے اور جو منسٹر مجھے اندر ملا تھا اُس کا ایک عزیز ناظم تھا اُس کی طرف سے یہ کیا گیا تھا یعنی منافقت کی گئی۔ فنکشن میں اُن منسٹر کی طرف سے مجھے ملنے کے بعد کہا جا رہا تھا کہ ان کا خاص خیال رکھا جائے اور ساتھ ہی اس دوران FIR کروائی جا رہی تھی۔ اصل میں وہ انتقامی کارروائی کرنا چاہتے تھے انہوں نے ہمیشہ ایسا ہی کیا۔ ہماری فیملی میں سے بھی آج تک ان کو کبھی الیکشن کے لیے بلایا گیا اور نہ ہی الیکشن کے لیے کوئی بات چیت کی گئی اور نہ ووٹ ہی دیا گیا۔ دوسرا یہ کہ ہم نے اُن کی تابعداری نہیں کی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ باقی لوگ تو تابعداری کرتے ہیں یہ لوگ کیوں نہیں کرتے ہماری انگریزوں کے زمانے سے سُپیریئر پوزیشن رہی ہے یہ سب دیکھنے کے بعد میں نے عملی طور پر پھر اُس پارٹی میں کام نہیں کیا۔

اپنے تجربات کی بنیاد پر شبیر کو صنف سے متعلق عملی اسباق ملے جن کو انہوں نے یوں بیان کیا:

چند سال پہلے کی بات ہے مجھ سے ایک عورت نے فون پر رابطہ کیا اور بتایا کہ اس کا شوہر اس پر تشدد کرتا ہے، اُس کی جائیداد ہتھیانہ چاہتا ہے اور وہ اس سلسلے میں مدد چاہتی ہے۔ مَیں نے انہیں ضروری کاغذات لے کر آنے یا کسی کے

ہاتھ بھجوانے کا کہا۔انہوں نے بتایا کہ وہ لوگ انہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں اور وہ گھر سے نہیں نکل سکتیں مَیں نے اپنے طور پر پہلے تسلی کر لی کہ وہ کس علاقے سے ہے اور دوسری ضروری ابتدائی معلومات لیں۔جب میں وہاں خود پہنچا اور ابتدائی معلومات اکٹھی کیں تو پتا چلا کہ وہ خُلع لینا چاہتی ہیں اور شادی کے بعد بھی اُن کے دوسرے مرد سے تعلقات ہیں،مکان کے کاغذات بھی جعلی سٹیمپ پیپر پر لیے گئے ہیں اور مکان اصل میں اُن کے شوہر کی جائیداد ہے۔اس واقعہ کے بعد دو پہلو سامنے آئے ایک کہ اتنی زیادہ سٹڈی کئے بغیر کسی کو مدد فراہم کرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔یعنی اگر میں نے کوئی قدم اُٹھانا ہے تو پہلے مجھے اچھی طرح جانچ پڑتال کرنی ہے۔دوسرا کیونکہ ذاتی تجربہ بھی تھا اُس کی تفصیل مَیں نہیں بتانا چاہتا۔مَیں نے محسوس کیا کہ سراسر عورتیں بے قصور نہیں ہیں بعض اوقات مرد بھی بے قصور ہوتے ہیں۔

عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کے حوالے سے خاندان میں کچھ لوگ ابھی بھی حامی نہیں ہیں،شبیر نے اس بارے میں بیان کیا کہ:

ہمارے گھر میں خواتین ابھی زیادہ پڑھی لکھی نہیں،میٹرک یا F.A تک ہیں۔میرا بھتیجا(وقار)ابھی FSc. رہا ہے،اس کا ابھی بھی یہ ماننا ہے کہ لڑکیوں کو نہیں پڑھنا چاہیے۔اُسکی ایک بہن ہے یعنی میری بھتیجی۔جب اُس کو تعلیم دینے کا موقع آیا تو وقار نے مخالفت کی کہ اس کو گھر کے قریب پرائمری سکول ہے وہاں پڑھنا چاہیے لیکن شہر والے سکول میں نہیں۔ہم نے تو اپنے زمانے میں ٹاٹ والے سکولوں سے پڑھ لیا لیکن اب ڈی جی خان میں انگلش میڈیم سکول عام ہیں اور ہمارا گھر شہر سے 10 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔وقار نے کہا کہ ان کا آنا جانا،لانا لے جانا مسئلہ ہوگا اس بنیاد پر اُس کو ایڈمیشن نہیں دلانا چاہیے جس طرح عام گھروں میں ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو سمجھایا جاتا ہے اگر کوئی نہ مانے تو اُسے فورس بھی کر دیتے ہیں مَیں نے بھی اُسی طرز پر اُس کو تھوڑا احساس دلایا کہ اُس کو پڑھنا چاہیے لیکن اُسکی وہی بلوچی سوچ تھی۔مَیں نے بھائی سے بھی بات کی۔جو اُس کی والدہ ہے وہ بھی خواہش مند تھیں کہ میری بیٹی پڑھے۔جب اُس نے بھی زور دیا بیٹی کی تعلیم کو آگے بڑھانے کے لیے تو وہ مان گیا لیکن جب وہ سکول اکٹھے جاتے اور وہ گاڑی سے اترتی تو وقار فوراً بھاگ جاتا تھا کہ کہیں اُس کے کلاس والے یا سٹوڈنٹس نہ دیکھ لیں کہ اُس کی بہن بھی یہاں پہ پڑھ رہی ہے۔

سکول کے اندر وہ سٹڈی کے دوران بھی کوشش کرتا تھا کہ وہ الگ رہے۔مَیں نے جب یہ سب کچھ نوٹ کیا تو سوچا وقار مجبوراً مان تو گیا لیکن دل سے تسلیم نہیں کیا لیکن وقار کے ساتھ لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے تھوڑا بہت مثبت چینج آ گیا ہے یعنی اُس کی سوچ میں کچھ تبدیلی ہے۔

شبیر نے تشدد کو روکنے سے متعلق بہت سے اقدامات رضا کارانہ طور پر کئے ان میں سے کچھ واقعات کا ذکر انہوں نے یوں کیا:

ہمارے دیہی علاقوں میں مزدور پیشہ لوگ گندم کی کٹائی کے موسم میں دور دراز کھیتوں میں کٹائی کے لیے جاتے رہتے ہیں۔پڑوسی گاؤں کے ایک ایسے ہی خاندان نے اپنی 9 سالہ بچی کو گھر چھوڑا اور خود گندم کی کٹائی کے لیے روانہ ہو گئے۔جب واپس آئے تو بچی گھر پر نہیں تھی۔رشتہ داروں سے معلوم کرنے پر بھی کچھ پتا نہ چل سکا۔بچی کی گمشدگی کا اعلان کروایا گیا اور جگہ جگہ تلاش شروع ہوئی۔تلاش کے دوران کسی نے بتایا کہ محلّہ میں کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پہ ایک مشکوک بوری پڑی ہے۔بوری کھلنے پر دل دہلا دینے والا منظر سامنے آیا۔یہ اُسی بچی کی لاش تھی جسے اذیت کے بعد قتل کر دیا گیا۔علاقے میں کہرام مچ گیا۔بچی کے والدین نے قتل کی FIR درج کروادی۔ابتدائی طبّی رپورٹ کے مطابق بچی

کے ساتھ ریپ کیا گیا تھا اور بعد میں قتل کر دیا گیا،پولیس نے DNA ٹیسٹ بھی کیا لیکن اس اندھے قتل کا سراغ نہ لگ سکا کچھ دنوں کی کوشش کے بعد پولیس نے اس کیس میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ہم نے اس کیس کو میڈیا میں اُٹھایا اپنی طرف سے اظہارِ یکجہتی اور افسوس کے طور پر ایک پریس کانفرنس کی اور پولیس کے موقف کو بھی سامنے لائے۔کچھ عرصے بعد ہی اس مسئلے کا سپریم کورٹ کی طرف سے ازخود نوٹس لیا گیا اور پریشر بڑھنے پر پولیس نے دن رات ایک کر دیا،مجرم گرفتار کر لئے جن میں دو لوگ ملوث تھے۔ایک دور دراز شہر ملتان کا تھا اور دوسرا مقامی،بعد میں ہم نے پولیس کے کام کو سراہا۔

ایک اور اسی طرح کا واقعہ جہاں شبیر نے سیاسی مخالفت کے باوجود متاثرین خاندان کے ساتھ امدادی کردار ادا کیا:

یہاں قریب ہی ایک واقع ہوا ایک 16,17 سالہ لڑکی فرزانہ کو اغواء کیا گیا،اور کچھ عرصہ تک اُس کے ساتھ اجتماعی زیادتی ہوئی۔اُس کے بعد اُسے فروخت کر دیا گیا۔لڑکی کے والد نشے کے عادی تھے اور کسی انتقامی کارروائی کا شکار ہو کر جیل میں بند تھے اور یوں اُس کی غیر موجودگی میں اُس کی بیٹی کو اغواء کروالیا گیا۔وہ لوگ دو تین ماہ تک اس کو باندھ کر نشہ دیتے رہے۔بے ہوش بھی کر دیتے تھے،مختلف لوگ اُس کے ساتھ زیادتی کرتے رہے۔لڑکی کے بھائیوں کو مجرموں کا پتا تھا انہوں نے FIR درج کروائی تو مخالفین جن میں مقامی زمیندار ملوث تھا،نے ارادہ قتل کی جھوٹی FIR میں انہیں حوالات میں بند کروادیا۔باپ تو جیل میں تھا ہی بیٹوں کو بھی پھنسا دیا گیا۔زمیندار نے انہیں بلیک میل کیا کہ آپ نے ہمارے اُوپر جھوٹا مقدمہ کیا ہے آپ اپنا مقدمہ واپس لیں تو ہم اپنا لے لیں گے۔جیل سے رہائی کے بعد لڑکی کے والد نے مجبوراً وہ FIR واپس لے لی۔تب تک فرزانہ بازیاب کرا کے نہیں دی گئی تھی۔

جیل سے نکلنے کے بعد فرزانہ کے گھر والوں نے ایک اور مقامی زمیندار کے ساتھ رابطہ کیا جو انھیں وکلاء کے پاس لے آیا۔یہاں پر دو سیاسی گروپ تھے اور ملزم پارٹی کے کچھ لوگ ایک گروپ سے تھے اور کچھ دوسرے سے۔وہ کسی ایک گروپ کے پاس بھی جاتے تو دونوں طرف سے اُن کو سپورٹ مل رہی تھی اور دوسری طرف متاثرین کو کوئی سپورٹ نہیں تھی۔

جس زمیندار کے ساتھ یہ لوگ آئے تھے وہ بہت خفیہ طریقے سے ان کو سپورٹ کرتا تھا۔مجھے ایک وکیل دوست نے اس کیس پر رابطہ کیا۔مَیں نے تفصیلات پوچھیں جس کے بعد میرا خیال تھا کہ Human Rights Commission کے ذریعے اس کیس کو اُٹھایا جا سکتا تھا۔

قانونی طور جب کسی جرم کی ابتدائی رپورٹ خارج ہو جائے تو دوبارہ درج نہیں ہو سکتی۔اس بنیاد پر اس کیس کو عدالت نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔میں نے اپنے دوست سے ملتان میں رابطہ کیا جو کمیشن برائے انسانی حقوق پاکستان میں ایڈووکیٹ ہیں۔متاثرہ خاندان کو وہاں لے گیا اور اُن سے مُلوایا۔وہاں بھی یہ بحث ہوئی کہ چونکہ مقدمہ واپس لیا جا چکا ہے اب دوبارہ نہیں ہو سکتا لیکن سیشن کورٹ میں ان کی طرف سے ایک درخواست جمع کرادی گئی تھی تاکہ شنوائی ہو سکے۔پھر اس مسئلے کو ہم میڈیا میں لائے،یہاں ایک پریس کانفرنس کرائی گئی لیکن میڈیا نے اس موقع پر کچھ صحیح تعاون نہیں کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ جب انہیں پتہ چلا کہ دوسری طرف بااثر اور مضبوط گروپ ہے تو انہوں نے خبر لگانے سے انکار کر دیا۔مَیں نے انہیں یہ احساس دلایا کہ یہ مسئلہ ہمارے معاشرے میں اُٹھا ہے تو خبر لگانا آپ کی ذمہ داری بنتی ہے،ویسے تو

آپ کہتے ہو کہ ہم ایک معاشرے کی آنکھ اور کان ہیں تو اب آپ کی ذمہ داریاں کہاں گئیں اس کے بعد انہوں نے خبر لگا دی۔

بعد میں ایک دفعہ مَیں کچہری اپنے کام سے گیا ہوا تھا تو اتفاقاً وہ متاثرہ خاندان بھی وہاں پر موجود تھا کیونکہ یہ معاملہ تو منظر عام پر آچکا تھا ہمارے علاقائی میڈیا کے ایک بندے نے جو مجھے جانتا تھا کہا کہ یہ تو فلاں لوگ ہیں اور ایک سیاسی گروپ کے اوپر انہوں نے مقدمے کر رکھے ہیں تو آپ ان کو سپورٹ نہ کرو مَیں نے اُس پر اتنی توجہ نہیں دی پھر ایک دن مجھے وہاں کے ناظم کی کال آئی اور اُس نے یہاں کے ایک بڑے فیوڈل کا نام لیتے ہوئے کہا اُس نے میرا کیا بگاڑ لیا تھا کہ تم کچھ کرلو گے، آپ اُن کو سپورٹ کر رہے ہو وہ اُس وقت کافی غصّے میں تھا، میری بات سنے بغیر اُس نے کال بند کر دی، اُس بات پہ میری دل آزاری ہوئی مَیں نے سوچا اُس کا رویہ بہت آمرانہ تھا کہ اُس نے میری بات بھی نہیں سنی۔ مجھے اُس پہ تھوڑا بہت غصّہ آیا تھا مَیں نے سوچا اس کا مطلب ہے کہ اگر وہ سیاسی طور پر اتنی مضبوط پوزیشن رکھتا ہے تو ہم بھی تو اس سوسائٹی کا حصّہ ہیں۔ مجھے لگا کہ اس سوسائٹی میں کمزور کو سپورٹ کرنے والے یا کمزور کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ سوچ کر میں جذباتی ہو گیا اور ذہن میں مختلف خیالات آنے لگے۔ مَیں نے سوچا کہ یہ نہیں ہونا چاہیے بعد میں وہ اُس فیملی کو خفیہ سپورٹ کرنے والا میرے پاس آیا اور متاثرین کو مجھ سے ملوایا۔ انہوں نے میری سپورٹ کو سراہا اور احساس دلایا کہ دوسری طرف کا گروپ آپ کے مخالف ہے۔ مَیں نے انہیں یقین دلایا کہ میری آپ کے ساتھ مدد بحیثیت انسان کے ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں آپ کی حق تلفی ہوئی ہے اور یہ زیادتی ہے تو انسانی حقوق کے نقطہ نظر سے میں آپ کو بلا امتیاز سپورٹ کر رہا ہوں مَیں یہ نہیں دیکھ رہا کہ آپ کون ہو کہاں سے آئے ہو، مَیں نے اُن پہ واضح کیا کہ کسی کا لحاظ کیے بغیر جتنا ہو سکے گا میں آپ کی مدد کروں گا۔ اس کے بعد میرا رابطہ اُس خاندان سے محدود ہو گیا اور میں بھی اپنے روزمرّہ کاموں میں مصروف ہو گیا کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ لڑکی کو ڈی جی خان کے نواحی علاقے بیٹ ملی سلطان سے بازیاب کروایا گیا، وہ وہاں تقریباً 9 مہینے تک قید میں رہی تھی۔

شبیر نے اپنے علاقے میں قائم کردہ گورنمنٹ کے غیر رسمی سکولوں میں تعینات ٹیچرز کے مسائل بھی حل کرنے میں اُن کی مدد کی۔ انہوں نے ایک واقعے کا ذکر کیا جس میں سکول ٹیچر کو جنسی طور پر ہراساں کیا گیا۔ شبیر نے اس مسئلے کو محکمہ تعلیم کے ساتھ اُٹھایا اور اس کے حل کے لیے ٹیچر کی مدد کی۔ اِسی طرح مقامی NGO کے دفتر میں ایک مرد ملازم کے اپنی سینئر خاتون ساتھی سے نامناسب رویے پر اس کو سمجھایا اور اس بات کی ترغیب دی کہ خواتین بھی وہ تمام کام کر سکتی ہیں جو وہ بحیثیت مرد کر سکتے ہیں۔ اگر وہ اُن سے سینئر ہیں اور اُن کو کوئی حکم دیتی ہیں تو اُنہیں اسے پورا کرنا چاہیے اس سے اُن کی ہتک نہیں ہوگی۔

بچوں کی تربیت کے حوالے سے شبیر نے اپنے بچپن سے سیکھے گئے کچھ عملی سبق لاگو کیے انہوں نے بتایا:

بچپن میں میرے ایک ماموں تھے انہوں نے مجھے سگریٹ کا ایک ٹکڑا پیتے دیکھ لیا تھا اور انہوں نے بہت آرام سے مجھے سگریٹ کے نقصانات سے آگاہ کیا اور زور دیا کہ میں آئندہ ایسی حرکت نہ کروں۔ ان کے اس طرح منطقی طریقے سے بیان کرنے پر ساری بات میری سمجھ میں آگئی اور اس کے بعد آج تک میں نے سگریٹ نہیں پی ہے۔

اسی واقعہ سے میں نے اخذ کیا کہ عملی زندگی میں بھی اپنے بچوں کی تربیت اسی طریقے سے کروں گا۔ آج اگر اپنی بیٹیوں کو گائیڈ کرنا ہوتا ہے تو بجائے جسمانی مار پیٹ کے، زبانی اور پیار سے سمجھاتا ہوں وہ کوئی بھی ایسا کام کر دیں جو نامناسب

ہو یا ڈسپلن کے خلاف ہو تو میں انہیں آرام سے سمجھاتا ہوں۔

میری مسز کبھی کبھار ان کی پٹائی کرتی ہیں لیکن میری کوشش رہتی ہے کہ میں اپنی بیٹیوں کے اوپر کبھی ہاتھ نہ اُٹھاؤں جب کبھی بہت تنگ کرتی ہیں تو کہتا ہوں کہ ایسا کچھ نہ کرو کہ آپ کو کوئی جسمانی اذیت دے۔ جس طرح میرے بچپن میں زبانی طور پر گائیڈ کیا گیا میں بھی بچوں کے ساتھ خوشگوار ماحول رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

اپنی ازداوجی زندگی کے حوالے سے اشارۃً شبیر نے کہا:

شادی کے بعد ہر شخص کا ایک خواب ہوتا ہے، میرے معاملے میں وہ خواب کسی حد تک پورا نہیں ہُوا۔ اِس بنا پر ایک دو بار سوچا کہ دوسری شادی کروں لیکن جب اپنی بیٹیوں کو دیکھتا ہوں تو اپنا بچپن یاد آتا ہے جب ہمارے والد نے بھی ہماری اتنی ہی عمر میں دوسری شادی کر لی تھی اور اس وجہ سے میں سمجھتا ہوں ہم میں کچھ احساس محرومی رہا ہے، مَیں نہیں چاہتا میرے بچے بھی وہی حالات دیکھیں اِس لیے رُک جاتا ہوں۔

گھر والوں کی طرف سے کبھی اتنی حوصلہ شکنی نہیں کی گئی۔ چھوٹا بھائی ابھی بھی کہتا ہے کہ آپ مفت خورے کام کرتے رہتے ہیں (قہقہہ)۔۔۔ایسے کام کہ جس میں آپ اپنی طرف سے بھی خرچہ کر دیتے ہیں مَیں ان باتوں کا بُرا نہیں مانتا، والدین نے بھی تھوڑا بہت کہا کہ اپنے آپ کو بھی ہر لحاظ سے محفوظ رکھو اگر ضروری ہے تو متاثرین کو جتنا ہو سکتا ہے مدد کرو۔

اسی طرح کوئی مشکل کام ہو تو دوستوں کے ساتھ شیئر کر لیتا ہوں اور پھر ہم مل بیٹھ کہ منصوبہ بندی کرتے ہیں کہ اس کو کس طرح لے کر چلا جائے۔ اس طرح دوستوں کی طرف سے بھی کافی مدد مل جاتی ہے۔

میں نے یہ کوشش کی ہے کہ بیٹیوں کی چھوٹی سے چھوٹی خواہش بھی پوری کروں انہوں نے اگر کہا کہ ہمیں پارک لے چلو تو میں اپنے کام جلدی نپٹا کر ان کو گھمانے پھرانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اپنے کاموں میں مصروفیت کی وجہ سے بعض اوقات کچھ چیزیں ان کی خواہش کے مطابق نہیں بھی کر پایا، کبھی وقت نہیں دے سکا تو بچیوں کی طرف سے یہ شکایت مجھ تک پہنچتی رہی کہ آپ ہمیں وقت کم دیتے ہیں۔ یہ خواہش بھی ہے کہ ان کو ایڈمنسٹریٹو سطح پر گورنمنٹ میں اچھی پوزیشن دلاؤں بے شک بیٹیاں ہیں لیکن مَیں ان سے کہتا ہوں کہ آپ کو میں ڈی سی او (District Coordination Officer) بناؤں گا، آپ دل سے پڑھو لکھو، جب آپ بن جاؤ گی ڈی سی او اور میں آپ کے آفس میں آؤں گا تو آپ اپنے ڈرائیور کو کہنا کہ پاپا کو چھوڑ آؤ۔۔تو یہ کچھ خواہشات اور خواب ہیں۔

تجزیہ

اِس باب میں ان پانچ لوگوں کے تجربات کا تذکرہ ہے جنہوں نے ہمارے ساتھ اپنی کہانیاں شیئر کیں۔ان پانچوں میں ایک بات مشترک ہے کہ انہوں نے عورت، بچہ یا بچی پر ہونے والے جنسی تشدد کے خلاف واضح مثبت اقدام کیا۔ان کی کہانیاں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان کے قرب وجوار کے اثرات بھی کہانیوں میں جھلکتے ہیں۔ کچھ شرکاء نے وضاحت سے اپنے بارے میں بتایا جبکہ دیگر شرکاء کچھ خاص باتوں کو شیئر کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار رہے۔تاہم تمام شرکاء کی کہانیوں میں یہ مماثلت پائی جاتی ہے کہ ان سب مردوں نے کوششیں کیں اگرچہ ان کے حالات وواقعات مختلف تھے۔یہ ان پانچ مردوں کے مردانگی کے تجربات کا بیان ہے جن کی زندگیاں عورتوں کی زندگیوں کی طرح صنفیت میں بٹی ہیں۔

اِس باب میں ہم ان عنوانات پر فوکس کریں گے جو کہ ان مردوں کی کہانیوں سے نکلے ہیں۔ان میں سے کچھ عنوانات ایسے ہیں جو اپنی زندگی کے تجربات بیان کرتے ہوئے خود ہی نکل کر سامنے آئے۔مثال کے طور پر شرکاء کا ان کے والد کے ساتھ تعلقات یا بچپن میں تشدد کو دیکھنا وغیرہ۔ کچھ عنوانات کے بارے میں بالخصوص پوچھا گیا، مثال کے طور پر مثبت اقدام کی نوعیت وغیرہ۔ کچھ عنوانات کے بارے میں بالخصوص پوچھا گیا مثال کے طور پر مثبت اقدام کی نوعیت وغیرہ۔

عنوانات کی مختلف درجوں میں تقسیم خاصا مشکل کام رہا کیونکہ تمام عنوانات ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں، شرکاء کی زندگیوں کو دوراتی (chronological) ترتیب، ان کے بیانیہ میں مردانگی کا ذکر اور مثبت اقدامات کے حوالے سے دیکھا گیا۔حاصل کردہ معلومات کو انہی عنوانات کے تحت بیان کیا گیا بشمول بچپن کے واقعات، متاثرہ یا تشدد کرنے والے کے طور پر تشدد سے واسطہ، مردانگی کی بُنت، شرکاء کی زندگیوں میں مثبت اقدام کی اہمیت اور آخر میں ان لمحات کا بیان جب انہوں نے مردانگی کے مروجہ نظریہ سے انحراف کیا۔

باپ اور ماں: شخصیت ساز

مردانگی کو بنانے میں عمومی تعلقات اہم ہوتے ہیں (پاپکنز 2006)۔ ہماری اس تحقیق کے دوران تقریباً سبھی مردوں نے اپنے باپ کے بارے میں بتایا کہ وہ ان کا احترام کرتے ہیں۔شرکاء نے اپنے باپ کا تذکرہ ان سے جڑے ہوئے خوف کی وجہ سے بھی کیا۔'انہوں [شرکاء] نے انہیں طاقت کے ساتھ جوڑا' (پاپکنز 2006، ص 347)۔ پانچوں شرکاء کی پرورش روایتی خاندانوں میں ہوئی جہاں روزی کمانے کی ذمہ داری باپ پر تھی اور گھر میں ان کی حیثیت نمایاں اور گھر والوں کو قابو میں رکھنے والے کی تھی۔

خیبر پختونخوا کے شہر صوابی سے تعلق رکھنے والے اکبر نے اپنے باپ کے الفاظ شیئر کیے ''جب ٹوپی والا موجود ہو تب سلام کرنا ہے، صرف ٹوپی کو سیلوٹ نہیں کرنا''۔ اکبر کے باپ نے اپنی بیوی کو ٹوپی سے تشبیہ دی۔ٹوپی یا وردی جو کہ اختیار کو ظاہر کرتی ہے اور وہ اپنے آپ کو ٹوپی والا کہتا تھا چونکہ وہ اصل اختیار کا مالک تھا۔ جبکہ صرف ٹوپی یا وردی کھوکھلے اختیار کی علامت ہوتی ہے۔

ماں کا ذکر اس پیرائے میں کیا گیا کہ وہ باپ کی فرمانبردار تھی۔ بچوں کو اہم اقدار سکھانے کا کام باپ کا تھا۔ اسلام آباد سے شاکر نے کہا ''ہاتھ سے کام کرنے کا کہا گیا بلکہ ہمیں والد کہتے کہ گلی میں جھاڑو لگائیں''۔اسی طرح جنوبی پنجاب کے شہر ڈیرہ غازی خان سے شبیر نے بتایا''[ہمیں کہا جاتا تھا] کہ مہمان کے لئے ہاتھ سے کام کرنا، چاہے وہ کسی بھی کلاس سے تعلق رکھتا ہو بلکہ بعض اوقات تو ہمیں اوطاق (بیٹھک، مہمان خانہ) میں جھاڑو تک لگانا پڑتا تھا''۔

انہوں نے اپنے باپوں کے بارے میں احترام سے بات کی اور ان کی تعریف کی۔ روزی کمانے کے حوالے سے مشکلات کا سامنا کرنا اور دوسروں کی خاطر قربانی دینے کے حوالے سے باپ کے کردار کو بہت سراہا۔ سکھر، سندھ سے محمد علی نے کہا ''میرے والد بہت محنت کرتے اور انہوں نے بہت مشکل وقت کاٹا، وہ ریل کی پٹڑی پر پتھر بچھانے کا کام کرتے تھے، سوکھی روٹی ساتھ لے جاتے اور جب بھوک لگتی وہی پانی میں بھگو کے کھا لیتے''
اکبر نے بتایا: ''کافی دفعہ میرے والد کے پاس کرائے کے پیسے بھی نہ ہوتے اور وہ کئی کلومیٹر پیدل آجاتے اور اگر کوئی پوچھتا تو کہتے کہ ایسے ہی واک کر رہا ہوں، بہت ایماندار تھے، اس کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ ہم نے TV (ٹیلی وژن) اُن کی ریٹائرمنٹ کے بعد خریدا تھا''

باپ کی بحیثیت ایک اچھا ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے والا، سچا اور قابل عزت شخص کے بہت ساری کہانیاں تھیں۔ اکبر نے بڑے فخر سے بتایا کہ کس طرح اس کے باپ نے تین بہنوں کی شادیاں سرکاری افسروں سے کرائیں۔''یہ حقیقت ہے، پھر اِسی وجہ سے ہماری بہنیں جنہوں نے اچھی طرح تعلیم حاصل کی تھی، وہی ہے کہ والد نے ان تمام بیٹیوں کی شادیاں جہاں کی ہیں۔ وہ 17 گریڈ میں تھے، یہ بھی ہماری بہنوں کی خوش قسمتی تھی کہ ان کے اچھی اچھی وہ جگہ رشتے ہوئے، اس میں یہ تھا کہ میرے والد صاحب کی تربیت بہت اچھی تھی''

بعض اوقات ان تعریفوں کے ساتھ طنز بھی ہوتا تھا۔ محمد علی کے کیس میں یہ طنز بہت نمایاں ہے جب اس نے اپنے باپ کا ماں پر تشدد کا تذکرہ کیا۔
''ہاں ان کا پورا اوور آل رویہ پورے گھر کے ساتھ صحیح نہیں تھا۔ مثال کے طور پر وہ میری ماں کو مارتا تھا، وہ بیچاری ایک بہت سادی عورت تھی گاؤں کی، میرے والد کے مرنے کے بعد، حالانکہ وہ اس کو مارتا تھا تب بھی اس کے لئے روتی تھی لیکن کئی مرتبہ مجھے یاد ہے وہ ان کو مارتے تھے۔''

شاکر نے بتایا کہ اس کے انجینئر بننے کی خبر پر کس طرح اس کے باپ نے بے دلی سے رضامندی کا اظہار کیا۔ ''وہ چاہتے یہی تھے کہ ڈاکٹر ہو جائے بہتر ہے لیکن میڈیسن میں میرا کوئی خاص انٹرسٹ نہیں تھا لیکن آئی تھنک وہ ویسے بھی بہت زیادہ پُر جوش آدمی نہیں تھے، وُہ تھوڑا ویسے بھی سخت دماغ کے بندے تھے تو ان کا جو اِن پُٹ (input) ہوتا تھا وہ ایسا ہی ہوتا تھا، ہوتا ہے نا کہ کئی لوگ جو ہوتے ہیں وہ خوش ہو جاتے ہیں، آپ کو گلے لگا لیا اور (وقفہ) گلے لگا کر بھی خوش ہوتے تھے لیکن کچھ نہ کچھ سخت بات کہتے تھے۔''

شاکر نے اسے تنقید کا نشانہ بھی بنایا اور خود کو باپ سے علیحدہ بھی محسوس کیا جب وہ اپنے باپ کے بارے میں بتاتا تھا کہ کس طرح وہ بیوی اور بچوں کے ساتھ اپنے رشتوں پر خود ساختہ اُصولوں کو ترجیح دیتا تھا۔ درج ذیل مثال میں یہ صورت حال واضح ہو جاتی ہے جو کہ باپ کے کردار سے جڑی اقدار کے متعانی ہے۔

''میرے والد اپنی طرف سے جو اُن کے اصول تھے اُس پہ وہ چلتے رہے لیکن جو relationships تھے وہ نہیں چلا سکے اس وجہ سے ایک dichotomy سی رہی، اگر کسی کے بڑے اصول ہیں بڑے پرنسپلز ہیں لیکن اگر وہ human relationships کو نہیں value کرتے تو ultimately آپ کی زندگی کامیاب نہیں ہوتی human relationships are very valuable، اُصول اپنی جگہ ہیں لوگ کہتے ہیں جی بڑا با اُصول بندہ ہے لیکن اگر وہ اپنے قریبی لوگوں کو نہیں چلا سکتا تو وہ اصول تو دُور کے لوگ دیکھتے ہیں نا، قریب کے لوگ اتنا نہیں دیکھ پاتے تو human relationship کو چلانا بہت اہم ہے، تو اس سے میرے خیال میں میرے اپنے relationship پر اثر پڑا''

دوسرے شرکاء بری یا منفی طاقت رکھنے والی شخصیات (باپ) کو تنقید کا نشانہ بنانے میں قدرے محتاط تھے۔ شبیر کے باپ نے دوسری شادی کی۔ اگرچہ اس نے توجہ نہ ملنے کی وجہ سے گمشدہ بچپن اور اعتماد کے بکھرنے کی طرف اشارہ کیا مگر اس نے کھلے طور پر اپنے باپ کو تنقید کا نشانہ نہیں بنایا۔

'' (دوسری شادی کے بعد) والد صاحب کی طرف سے ظاہر ہے کہ کچھ توجہ تقسیم ہو گئی، بہر حال ان کی طرف سے تھوڑی توجہ رہی تھی لیکن وہ ہماری تعلیم کے حوالے کوئی اخراجات دیتے تو اُس (دوسری بیوی) کو برا لگتا تھا اُن کی کوشش تھی کہ یہ cut off رہیں یعنی نہ ان کا لینا دینا بھی نہ ہو، والد صاحب کی طرف سے (پہلے سا) رویہ نہیں رہا تھا ظاہر ہے پھر وہ چیز پرسنالٹی (personality) میں آجاتی ہے، تو اس وجہ سے شاید تھوڑا سا احساسِ محرومی بھی پیدا ہوتا رہا ہے اگر اس طرح کے تلخ تجربے نہیں ہوتے تو مزید میری qualities میں کچھ مزید اضافہ ہوتا اور اس سے بھی زیادہ کچھ جو خواہشات تھیں تو وہ incomplete بھی رہ گئی تھیں''

ایک اور موقع پر شبیر نے کہا ''اکثر والد کا ہی decision ہوتا تھا، ہماری بہت کم participation ہوتی، زیادہ تر

نہیں مانی گئی ہماری بات تو اس کا دُکھ رہتا ہے، parents کے وقار کے خلاف بھی نہیں تھا لیکن پھر بھی نہیں وہ step لینے دیا گیا''

اکبر نے بتایا کس طرح اس کا باپ اس کی ماں سے ناروا سلوک کرتا تھا جب وہ اپنے حقوق مانگتی تھی۔ جب اکبر کے دادا کا انتقال ہوا تو انہوں نے مدد کرنے کی خاطر جائیداد میں سے زمین کا کچھ فالتو حصہ اپنے چھوٹے بیٹے (اکبر کے چچا) کے نام کر دیا جو کہ اس وقت غیر شادی شدہ تھا۔

وقت گزرتا گیا اور اکبر کے چچا کی شادی نزدیک آ گئی تو اکبر کی ماں اور ممانی نے اپنے سونے کے زیورات اس کی شادی کے لئے پیش کر دیے اور بدلے میں کہا کہ زمین دے دو۔ چچا اکبر کے والد کی موجودگی میں مان گیا۔ اکبر کی نانی نے اکبر کی ماں کو کہا کہ اس کے باپ سے کہو کہ اس زبانی بات کو تحریری معاہدے کی صورت میں لے آئے چونکہ اسے اندیشہ تھا کہ جب بچے بڑے ہوں گے تو ان کی ضرورتیں بھی بدل جائیں گی تب کہیں یہ بات مسئلہ نہ بن جائے۔ اکبر نے سوچتے ہوئے کہا ''جب میری والدہ نے میرے والد کو یہ بات کہی تو اُس نے کہا اچھا تم نے یہ کہا کہ اس کے بدلے میں تم بھائی سے انگوٹھا لگاؤ پھر خوب پٹائی اس کی ہوئی تھی''

ان مردوں نے تشدد کے بارے میں بتایا جو کہ ان کے باپ نے اپنے گھر والوں پر کیا۔ اس کی مختلف صورتوں مثلاً جسمانی تشدد، معاشی کنٹرول یا آمد و رفت کو محدود کرنے کے حوالے سے بتایا۔ اس کنٹرول یا تشدد کا ذکر کرتے ہوئے کچھ شرکاء نے اس کے حوالے سے کھلے طور پر ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تاہم کہیں کہیں اشارۃً اس کو نامناسب قرار دیا۔ روزن کی سابقہ تحقیق (روزن 2010) جس میں ہم نے دیکھا کہ نوجوان لڑکے خواتین پر تشدد جیسے اقدامات کو غیر اہم سمجھتے یا انہیں وہ قابلِ توجہ ہی نہیں سمجھتے تھے اور اس کا یکسر انکار کر دیتے تھے کہ اس طرح کا کوئی عمل بھی ہوتا ہے۔ اس تحقیق کے برعکس موجودہ تحقیق میں مرد اپنی زندگیوں میں ایسے واقعات کو بتانے کے قابل تھے۔ ایسے کسی عمل کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ اپنے آپ کو اس سے الگ رکھتے تاہم غصے کا اظہار یا والد کے بارے میں واضح ناپسندیدگی کا اظہار ان کے لئے مشکل تھا۔ پس باپ کے بارے میں یہ بیانات دلچسپ تناؤ کا مقام ثابت ہوئے۔

باپ کی قربانیوں اور کمانے والے کی حیثیت سے یا کردار اور با اصول و با اختیار شخص ہونے کی وجہ سے آئیڈیل تصور کیا گیا۔ بیک وقت اس کی سرد مہری تک پہنچی اصول پسندی یا بدسلوکی اور جسمانی تشدد، یا ماں کے ساتھ ناروا سلوک کے حوالے سے باپ کی شخصیت کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا۔

ماؤں کے ساتھ لگاؤ اور ہمدردی کا واضح اظہار نظر آتا ہے۔ پانچ میں سے تین شرکاء کی ماؤں کے ساتھ انتہائی قربت تھی بغیر اس وجہ کے کہ بہن بھائیوں میں ان کا نمبر کون سا تھا۔ ایک کیس میں ماں کو اس لئے سراہا گیا کہ اس نے بغیر کچھ کہے اتنا تشدد سہا۔ ماؤں کے ساتھ تعلقات زیادہ اچھے تھے اور شرکاء اپنے احساسات ماؤں کے ساتھ شیئر بھی کر سکتے تھے اور

مدد بھی لے سکتے تھے۔ باپ کے ساتھ تعلق کی بنیاد اس شخصیت کا احترام ہے جو کہ اختیار کا مظہر، فرمانبرداری کی خواہشمند، اقدار سکھانے والی اور پرتشدد بھی ہوسکتی ہے۔

ان شرکاء نے اپنی زندگیوں میں جو پوزیشنز لی ہیں وہ ایسے مردوں سے یکسر مختلف ہیں جنہیں وہ 'رول ماڈل' سمجھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ان (باپ) کی تعریف بھی کرتے ہیں اور عزت بھی۔ چار کیسز میں مردوں شرکاء نے اپنے باپ کے امتیازی رویوں سے انحراف کیا اور عورتوں کے ساتھ پیش آنے کے لئے متبادل رویے اپنائے (اکرام کا اپنی بہنوں کے ساتھ، محمد علی کا رویہ خواتین کے ساتھ، اس کا پہلا پیار اور پہلی بیوی، شاکر اور اکبر کا اپنی بیویوں کے ساتھ)۔ پانچ میں سے چار مائیں گھر کا کام کاج کرتی تھیں۔ بیویوں میں سے چار ملازمت کرتی تھیں یا کرتی رہی تھیں اور ان سب کا کام NGO سیکٹر سے متعلقہ رہا۔

ہوسکتا ہے یہ سب بدلتے ہوئے حالات اور معاشرے میں خواتین کے لئے مزید مواقع پیدا ہونے کی وجہ سے ہو مگر ان مردوں کے گھریلو تعلقات کے حوالے سے جدید رویوں کو ظاہر کرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ روایتی مردانہ خیالات سے انحراف یا بُعد لازماً گھروں میں مثبت اور مضبوط رول ماڈلز (مائیں) یا صنفی طور پر حساس باپ کی وجہ سے نہیں (روجرز 2004) جیسا کہ کچھ تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے بلکہ یہ شعوری طور پر برعکس مقام (counter positioning) چننے کا نتیجہ ہے۔ اس حوالے سے تفصیلی بات آئندہ آنے والے عنوان 'مردانگی کو اپنانا اور انحراف کرنا' کے تحت کی گئی ہے۔

مرد اور تشدد: مظلوم اور ظالم

خیبر پختونخوا، گلگت بلتستان، پنجاب، سندھ اور وفاقی دارالحکومت کے علاقوں سے شرکاء اس تحقیق کا حصہ ہیں۔ اس تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان مردوں کی زندگیوں میں تشدد سے واسطہ ایک مستقل حقیقت ہے۔

بہت سارے مردوں نے گھروں پر بلاواسطہ تشدد کا سامنا کیا۔ اس کے علاوہ ماؤں اور بہن بھائیوں کو تشدد کا نشانہ بنتے ہوئے دیکھنے کی کہانیاں بھی تھیں۔ تشدد کرنے والے تمام مرد ہی تھے: باپ، چچا، بڑے بھائی۔ تین شرکاء نے بتایا کہ ان کے باپ ماؤں کو مارتے تھے۔ پاکستان کے تناظر میں یہ عام بات ہے۔ ایک حالیہ تحقیق جس کا نمونہ (sample) قومی سطح کا تھا، میں ظاہر ہوا کہ پاکستان میں 66% خواتین تشدد کا نشانہ بنتی ہیں۔ یہ تعداد دو تہائی کے برابر بنتی ہے۔ ان میں چودہ سال سے زائد عمر کی شادی شدہ اور غیر شادی شدہ خواتین شامل ہیں (اینڈرسن، 2009)

محمد علی کہتا ہے: ''میری ماں کو میرا باپ بہت مارتا تھا۔''

اکبر کہتا ہے ''جب میری والدہ نے والد سے کہا کہ لین دین کا بھائیوں سے انگوٹھا لگوالیں تو ان کی بہت پٹائی ہوئی۔''

اکرام: ''بہت چھوٹی چھوٹی باتوں پر، کبھی کھانے میں دیر ہے یا اس طرح (وقفہ) والد مارتے تھے، وہی جیسا ہمارا ٹریڈیشن (روایت) پرانا چلا آرہا ہے۔''

سکول میں جسمانی تشدد سے واسطہ پڑنے کا ذکر دو مردوں نے کیا۔ انہوں نے تفصیل سے بتایا کہ سکول میں انہوں نے کس کس طرح کا تشدد سہا۔ شبیر جس سکول میں جاتا تھا وہاں سنی طلباء کی تعداد زیادہ تھی۔ وقفہ نماز میں تمام سنی طلباء مسجد میں باجماعت نماز ادا کرتے۔ جبکہ شیعہ طلباء (جیسا کہ شبیر)، مسجد سے باہر یا کمرۂ جماعت میں نماز ادا کرتے۔ نماز کے بعد شبیر گراؤنڈ میں چلا جاتا جو کہ سکول کی عمارت کے پیچھے واقع تھا اور تب تک کھیلتا رہتا جب تک دیگر طلباء نماز ادا نہ کر لیتے۔ کچھ ایسے لڑکے جو نماز نہیں پڑھتے تھے وہ بھی کھیلتے رہتے۔ ''وہاں پہ ایک دن ہیڈ ماسٹر آ گیا، اس نے سب کو پکڑ لیا، بہت غصے میں تھا، اس دوران میں ان کو بتا نہیں سکا کہ یعنی یہ سچویشن تھی (وقفہ) مَیں باہر نماز پڑھ آیا تھا اور بہت زیادہ خوف بھی طاری ہوگیا تھا حالانکہ وہ انہیں بتا دیتا تو ممکن ہے کہ وہ مارنہ پڑتی''

اکرام اور اکبر دونوں نے بتایا کہ کس طرح چھوٹے لڑکوں کو جنسی طور پر ہراساں کیا جاتا ہے اور بڑے لڑکے اور مرد انہیں تنگ کرتے ہیں۔

اکرم نے بتایا، ''اسکول میں بھی اس وقت بھی یہ ہوتا تھا چھوٹے بچے ہوتے تھے یا جو خوبصورت ٹائپ کے لڑکے ہوتے تھے ان کے ساتھ یہ چیزیں ہوتی رہی ہیں اُن کو بہلا پھسلا کے یا ان کو لے جا کے ان کو تشدد کا نشانہ بناتے تھے''

یہ بیانیے ان پریکٹسس کو نمایاں کرتے ہیں جو کہ سکول میں نظم وضبط قائم کرنے کے لئے جسمانی تشدد کا استعمال کرتی ہیں۔ وہ (بیانیے) اس بات کی نشاندہی بھی کرتے ہیں کہ کس طرح لڑکے جنسی تشدد کے حوالے سے ضرر پذیر ہوتے ہیں جو کہ ایک حقیقت ہے۔

گھر میں اسلحہ رکھنا اور گلیوں میں ڈکیتیوں کی صورت میں تشدد جوانی میں جاری رہا۔ اس حوالے سے شاکر نے اپنا تجربہ بتایا، ''ان دنوں کراچی کے حالات بہت خراب تھے، آئے روز ڈکیتی کی وارداتیں ہوتی تھیں، ہم لوگ سوچتے تھے ہمارے پاس نہ زیور ہے، نہ کچھ اور ایسا کہ کوئی لوٹنے آئے لیکن پھر بھی ایک دن ہوگیا'' ''بعد میں بھی ایک بار ہوا لاہور میں ائیرپورٹ سے آتے ہوئے، میرا بیگ وَیگ اور سارا سامان لوٹ کر لے گئے''

اسی طرح فرقہ وارانہ تشدد کے حوالے سے بھی کہانیاں ہیں۔ اکرام نے گلگت بلتستان کا ایک واقعہ بیان کیا۔ ''شیعہ سنی کا یہاں بہت جھگڑا چلتا رہتا ہے۔ ایک بار ایک گروپ نے دوسروں کے چھ لوگ قتل کر دیے... ہم اس کے ساتھ ہی ایک جگہ ہے وہاں موجود تھے... پھر اسی گروپ کی ایک گاڑی آئی تو ہم لوگوں نے اس کو آگے جانے سے روک لیا اور محفوظ جگہ کھڑا کر دیا تو وہ لوگ بچ گئے...''

اسی طرح کی اقسام یونیورسٹی میں بھی پائی جاتی تھیں جن کا ذکر اکرام نے کیا۔ ''اور اگر کوئی لڑکا اس طرح کی حرکت

(بدمعاشی وغیرہ) کرتا تو وہ اٹھا کر لے جاتے تھے۔ بہت مارتے تھے، ان کے straight forward ٹارچر سیل ہوتے تھے، ٹانگیں شانگیں کاٹ ڈالتے تھے‘‘

محمد علی نے ایک واقعہ بتایا کہ جب وہ ناظم تھا تو اسے ایک دوست نے کہا کہ ایک بڑے آدمی کی پٹائی کرنی ہے، اس نے ایسا ہی کیا۔ بعد میں اسے افسوس ہوا اور ابھی تک اسے احساسِ ندامت ہے۔

تشدد کی مختلف صورتیں مقامی ماحول اور کلچر کے زیرِ اثر بنتی ہیں۔ مثال کے طور پر خیبر پختونخوا میں دشمنی ایک عام بات ہے اور یہ نسلوں تک چلتی ہے۔

اکبر نے ایک واقعہ کا ذکر کیا جس نے اس کی فیملی کو اس گھن چکر میں دھکیل دیا۔

’’انہوں نے سمجھا ہم ان کے دروازے پیٹیں گے اور ہماری بدمعاشی بن جائے گی لیکن اللہ کو کچھ اور منظور تھا (وقفہ) جب وہ نہ مانے تو ہم ڈبل سٹوری گھروں کی چھت پر چڑھ گئے اور فائرنگ کی، اللہ نے ہمیں عزت دی اور ہم نے مار نہیں کھائی‘‘

تشدد کا مردوں کی طرح مقابلہ کرنا مقامی کلچر کی مستقل ڈیمانڈ ہے۔ مقامی آئیڈیل مرد بننے کے لئے ضروری ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے۔ اکبر نے اپنے اندر مستقل چلنے والے مکالمے کا اظہار کیا۔ ایک موقع پر اس نے خود کو واقعہ سے الگ کرتے ہوئے کہا کہ شکر ہے اس کے پاس اس وقت گن تھی جب وہ مشتعل تھا۔ وہ گن جو کہ اس نے دوست سے ادھار دیے گئے پیسوں کے بدلے لی تھی۔ ایک اور موقع پر اس نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہ کامیاب و کامران رہا۔

تشدد سے واسطہ پڑنے پر کچھ لوگوں نے بروقت نمٹنے کے لئے تیار رہنا شروع کر دیا۔ مثال کے طور پر اکبر اور شاکر دونوں کو خطرہ ہے اور وہ اپنی حفاظت بھی کرتے ہیں مگر اپنے اپنے معاشرتی رتبے کے مطابق۔ اکبر کو ماضی میں قبیلے کی سطح پر ایک جھگڑے سے واسطہ پڑا اور اس نے سیلف ڈیفنس بھی کیا۔ بہرحال اس نے اعتراف کیا کہ وہ ابھی تک خطرہ محسوس کرتا ہے۔ اپنی حفاظت کے لئے وہ دوستوں سے مشورہ لیتا ہے اور محفوظ جگہ پر رہتا ہے۔ اس کے پاس گن نہیں تھی اور اس کا کہنا تھا اس کی زندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ کہتا ’’جو گولی میری قسمت میں ہے وہ مجھے لگے گی ہی لگے گی اللہ نے خود جو لکھ دیا وہ ہوگا‘‘ شاکر کے وسائل بھی تھے اور اس نے اپنے خاندان کے تحفظ کے لئے متعدد اقدامات کیے۔ اس نے کچھ حفاظتی اقدامات مثلاً سیکورٹی الارم، گارڈز اور پستول وغیرہ رکھنے کے بارے میں بتایا۔

تشدد ایک باقاعدہ حقیقت کے طور پر رہتا ہے۔ کبھی تشدد سے متاثرہ تو کبھی ارتکاب جرم کرنے والے کی حیثیت سے مردوں کا تشدد سے واسطہ پڑتا ہے۔ ہر مرد کی تشدد سے واسطہ پڑنے کی اپنی کہانی ہے۔ گھر سے لے کر اسکول کا گراؤنڈ، سیاسی سے سماجی تشدد، گھریلو تشدد سے لے کر ریپ اور ڈکیتی تک، ہر ایک نے مختلف نوعیت کا تشدد دیکھا۔ تاہم تشدد کی ان تمام اقسام اور صورتوں کی طرف ان کا ردعمل ان کی سماجی حیثیت اور مخصوص نسلی گروہوں سے تعلق ہونے کی وجہ سے جداگانہ رہا۔

مردانگی کو ثابت کرنا: ایک مشکل امر

مختلف سماجی حالات میں مردانگی کے تصورات بھی بدلتے ہیں۔ مرد اپنی زندگیوں میں مختلف کردار اپناتے ہیں جو کہ مختلف صورتوں کی دَین ہوتے ہیں (کورنوال، 2007)۔

بہت سارے مرد ’حاوی ہونے والی مردانگی‘ کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں مگر قریبی مشاہدہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ آئیڈیل مردانگی کو اپنانا ایک نہایت مشکل کام ہے۔

ایک شریکِ تحقیق نے بتایا کہ اِس کے باپ نے بچوں اور بیوی کے ساتھ رویہ حالات کو دیکھتے ہوئے تبدیل کیا۔ جب وہ لوگ سوات جیسے نسبتاً کم قدامت پسند علاقے میں سے اپنے آبائی گاؤں میں شفٹ ہوئے تو اس کے والد کا رویہ زیادہ سخت ہو گیا۔ اسی طرح کا مشاہدہ جاجی (جاجی 2009، ص 21) نے بھی کیا جہاں مردوں نے حالات کے تناظر میں کنٹرول، خاص کر عورتوں اور بچوں کو قابو کرنے کے نظریات میں تبدیلی لائی۔

جب ہم یہ بات کرتے ہیں کہ طاقت اور اختیار مردوں کو معاشرے کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے نہ کہ کوئی حیاتیاتی عمل ہے تو ہمیں یہ بھی جان اور مان لینا چاہیے کہ طاقت اور اختیار تمام مردوں کو یکساں طور پر نہیں ملتا۔ اسی لئے مردوں میں بھی مردانگی کے مختلف رنگ نظر آتے ہیں۔ یہ بات اس چیز کی نشاندہی بھی کرتی ہے کہ مردانگی میں کچھ خاص اقسام کو انتہائی پذیرائی ملتی ہے جبکہ دیگر اقسام کو اچھا نہیں سمجھا جاتا (سری واستو، 2009)۔ ہمیں اپنی تحقیق میں بھی یہ درجہ بندی نظر آتی ہے۔ جس مردانگی کو پسند نہیں کیا جاتا اس میں ’شریف، کمزور لڑکے‘ جو کہ خود کو منوا نہیں سکتے، اپنا تحفظ نہیں کر سکتے اور لڑکیوں کی مانند کمزور ہوتے ہیں وغیرہ شامل ہیں (جیسا کہ اکرام نے کہا)۔ کچھ لوگ بابو قسم کے ہوتے ہیں۔ یہ پڑھے لکھے اور سفید پوش لوگ ہوتے ہیں (جیسا کہ اکبر نے اشارہ کیا)۔ یہ مرد جسمانی طور پر اپنا دفاع نہیں کر سکتے۔

اکبر نے ایک واقعہ بیان کیا جس میں اس کے چچاؤں، بھائیوں اور اس کو ہراساں کیا گیا۔

’’’وہ تو اسلحے سے لیس تھے، وہاں پر چاچا نے کہا کہ جو فائر کرتے ہیں وہ بتایا نہیں کرتے ہیں لیکن ہم آپ کو عزت دیتے ہیں کہ آپ بیٹھ جائیں ورنہ ہم بھی ایسا کر سکتے ہیں، ان کی جو mind بنی ہوئی تھی یہ بس بابو ٹائپ کے لوگ ہیں بس دو یا تین تھپڑ ماریں گے اور یہ بھاگ جائیں گے اور یہ لوگ گھروں کی طرف بھاگ جائیں گے اور ہم دروازے پیٹیں گے اور اس طرح ہماری بدمعاشی بن جائے گی (وقفہ) اللہ نے کچھ اور چاہا تھا‘‘

’بابو ٹائپ‘ کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ تعلیم کی وجہ سے لڑائی جھگڑے سے کتراتے ہیں لہذا یہ کمزور مرد ہوتے ہیں۔ لفظ بابو کا تعلق نوآبادیاتی دور سے ہے جس میں پڑھے لکھے، انگریزی بولنے والے گورنمنٹ ملازمین کو بابو کہا جاتا تھا۔

(ہاپکنز 2006) کی طرف سے کی گئی ایک تحقیق سے بھی یہ بات سامنے آئی ہے کہ تعلیم مردانگی کو ’کم‘ کر دیتی ہے۔ جیسا کہ اُس تحقیق کے دوران مشاہدہ کیا گیا کہ پڑھے لکھے ایشیائی لڑکے نسبتاً افریقی لڑکوں کے ’زنانہ‘ ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ

ذکر ہے کہ مردوں کے مابین یہ تمام تر تقسیم مردوں کی ہی پیدا کردہ ہے۔

مردوں کو اپنے بچپن سے جڑے بے بسی کے لمحات کو بتانے میں نسبتاً آسانی رہی اگرچہ یہ سلسلہ جوانی میں بھی جاری رہا۔ ہمارے انٹرویوز کے دوران مردوں نے بتایا کہ وہ اپنی زندگیوں میں ناخوشگوار اور مشکل حالات میں بے بسی کے احساس کو محسوس کرتے ہیں۔ ہمیں ان مردوں کے کرداروں میں یہ بھی نظر آیا کہ بسا اوقات وہ روایتی، حاکمانہ اور قابو میں رکھنے والے رویے میں ہوتے ہیں تو کبھی اس کے برعکس دبے ہوئے اور عاجز۔

اکبر نے اپنی بے بسی کا بیان کیا جب اس کی ماموں زاد، جسے وہ بہت چاہتا تھا، سے منگنی ٹوٹ گئی۔ ''رات کو مجھے تیز بخار ہو گیا اور یہ لوگ مجھے ہسپتال لے گئے وہ دن میرے لئے کتنے مشکل تھے بتا نہیں سکتا ہوں آپ کو۔'' اس صورتحال میں اکبر نے اپنی تمام تر اذیت کے باوجود اپنے باپ اور بڑے بھائی کو فیصلہ کرنے دیا کہ وہ ماموں کے خاندان سے قطع تعلق کر لیں۔

محمد علی کو جب اس کے چچا نے مجبور کیا کہ وہ اس کی بیٹی کے ساتھ شادی کرے تو محمد علی نے خود کو بے حد بے بس محسوس کیا۔ ''میری شادی زبردستی کر دی گئی چچا کی بیٹی سے، مَیں اس وقت پندرہ سولہ سال کا تھا، ہماری حالت اُس وقت ایسی تھی کہ چچا کے غلام تھے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے''

شاکر کو بے بسی کا احساس اس وقت ہوا جب اس کی بیوی کا ریپ ہوا۔

'' مَیں نے اس واقعہ کے بعد کچھ بھی نہیں کیا، کر بھی کیا سکتے تھے اُن دنوں شہر میں بہت زیادہ ایسے واقعے ہو رہے تھے، پولیس کو بتاتے تو ان کو ہماری اور details معلوم ہو جاتیں اور وہ ہمیں تنگ کرتے''

شبیر کے کیس میں بے بسی کا تجربہ خواتین سے بات چیت کرنے میں پریشانی کی وجہ سے ہوا۔

''جب مجھے ان کے (خواتین) ساتھ کوئی میٹنگ کرنی ہوتی یا کچھ پوچھنا ہوتا تو بہت جھجک محسوس ہوتی confidence بالکل نہیں تھا اُن کی طرف دیکھتا بھی نہ، بات کرنا بہت زیادہ مشکل ہوتی تھی''

بے بسی کا احساس مردوں کو کمتر درجے کا مرد بناتا ہے اور 'آئیڈیل مرد' کے نظریے کو چیلنج کرتا ہے۔ مردوں کا اس احساسِ بے بسی کے حوالے سے ردِعمل مختلف تھا اور بعض اوقات ایک ہی فرد کے ردِعمل میں تضاد نظر آتا ہے۔ کسی ایک موقع پر وہ فرد غصّے اور تشدد کا اظہار کرتا ہے تو کہیں خاموشی اور عاجزی سے صورتحال کو برداشت کرتا ہے۔ تاہم یہ بات عیاں ہے کہ مردوں کے ردِعمل میں یہ درجہ بندی مردوں (جو غصّے اور تشدد کا اظہار نہیں کرتے) کے لئے تناؤ کا باعث بنتا ہے اور یہ تناؤ انہیں اکساتا ہے کہ وہ اپنی 'مردانگی' کو ثابت کرنے کے لئے ویسے ہی پرتشدد اور غصّے والے طریقے سے ردِعمل ظاہر کریں۔

گروس گرین نے ایک تحقیق کی جس میں یہ بات نکل کر آئی کہ جو مرد معاشی طور پر کمزور ہوتے ہیں وہ مردانگی ثابت کرنے کے لئے دوسروں پر حاوی ہونے کے ساتھ ساتھ پرتشدد اور جنسی تعلقات میں خواتین پارٹنر کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں (گروس گرین 2009، ص 7)

اکبر نے بتایا کہ جب 'بابو' قسم کے لوگوں پر حملہ کیا گیا تو انہوں نے شدت سے مزاحمت کی حتیٰ کہ ایک حملہ آور کو بھی مار دیا۔ اس واقعے کو یاد کرتے ہوئے اکبر نے روایتی مردانہ کردار سے جڑت کا اظہار کیا۔ اس مردانہ کردار میں دوسرے کو جسمانی طور پر زخمی کرنا اور نقصان پہنچانا اور اپنے زخموں کو کم سے کم سمجھنا مردانگی کا خاصہ سمجھا جاتا ہے۔

''مارنے نہیں بے عزتی کرنے کے لئے تیار ہو کر آئے تھے وُہ (قتل کرنے والے)، وہ چاہتے تھے کہ ہم بے عزتی کر کے چلے جائیں گے کہ یہ بابو ٹائپ کے لوگ ہیں سرکاری ملازم ٹائپ کے لوگ ہیں یہ کیا ہمارا مقابلہ کریں گے لیکن اللہ نے ہمیں عزت دی، عزت تو نہیں ہے (ہی ہی ہی) لیکن پھر اللہ نے عزت دی کہ ہماری عزت بچ گئی، ہم نے مار نہیں کھائی بیشک ہم دو زخمی ہو گئے اِس سائیڈ پہ (وقفہ) اور اُس سائیڈ پہ چھ زخمی ہو گئے، چھ نہیں بلکہ پانچ زخمی ہو گئے اور ایک جو تھا وہ مر گیا تھا اور وہ بندہ جس کو شیر بنا کر لائے تھے وہ گیدڑ کی طرح مر گیا تھا''

اپنی بیوی کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کے خلاف کچھ نہ کر پانے کے احساس نے شاکر کو بدل کر رکھ دیا۔ اس نے خود کہا کہ اب وہ ایک امن پسند شخص نہیں رہا اور آئندہ اس طرح کی صورتحال میں شدید ردِعمل کا اظہار کرے گا۔ اس کے خیال میں کسی مرد کو اگر مسلسل تشدد اور زیادتی کا نشانہ بنایا جائے اور وہ اس پر ردِعمل کا اظہار نہ کرے تو وہ 'احمق' ہے۔

''تو آپ پھر conscious ہوتے جاتے ہیں کہ آپ کیا کام کر رہے ہیں جسکی وجہ سے آپکو گن پوائنٹ پر لُوٹا جا سکتا ہے، دوسرا یہ کہ آپ اسلحہ میں مزید مہارت حاصل کر لیتے ہیں کیونکہ آپ کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے ہر دفعہ کوئی سر پر بندوق رکھ دیتا ہے، آپ کی گاڑی لے گئے، آپ کا سامان لے گئے، آپ کے گھر میں گھس آئے، اِس سے نپٹنے کا طریقہ ہے یا تو اسکو deter کیا جائے یا اگر آپ کو موقع ملتا ہے تو deal with it، اِسطرح آپکا mindset بدل جاتا ہے، کہ violence جو ہے وہ ختم کیا جا سکتا ہے by being very pacifist کیونکہ کہیں کہ جی ہم تو بڑے pacifist ہیں، ہم نے تو کبھی اسلحہ نہیں رکھا ہم نے کہا کہ ہم کبھی اسلحہ استعمال نہیں کریں گے۔ I have been non-violent یہ تو اس سے پہلے کی بات تھی لیکن اب اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو میں کہوں گا کہ ہاں میرے پاس بندوق ہے bullet is chambered، اتنا بھی stupid آدمی نہیں ہوتا کہ دیکھ رہا ہو کہ موقع ایک stage سے نکل گیا ہے، پھر آپ باقاعدہ تربیت لیتے ہیں، آپ judgement سیکھتے ہیں اور مزید مہارت حاصل کرتے ہیں، آپ pacifist سے تبدیل ہو جاتے ہیں کیونکہ آپ تشدد میں ڈوبے چلے جا رہے ہیں، کب تک اس سے آنکھیں بند کریں گے''

شاکر کی یہ بات بھی خاصی دلچسپ ہے کہ اس نے کہا بیوی کے ساتھ زیادتی کے بعد اس (شاکر) نے 'کچھ نہیں' کیا۔ حالانکہ شاکر نے اپنی بیوی کی پوری طرح مدد کی اور اس صدمے کے اثرات سے نکلنے میں مددگار رہا۔ بیوی کی مدد

کرنے کا جو طریقہ شاکر نے اختیار کیا وہ اس (شاکر) کے نزدیک ایسی صورت حال سے نمٹنے کے لئے کوئی بہت اچھا طریقہ نہیں تھا مگر اس کے باوجود اس کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے اس (بیوی) کی مرضی کے مطابق اس (بیوی) کی مدد کی۔ دراصل شاکر کا یہ سوچنا کہ اس نے کچھ نہیں کیا اس روایتی مردانہ سوچ کی عکاسی کرتا ہے جس میں بدلہ اور ایکشن ہی کو مناسب اور موزوں ردِعمل سمجھا جاتا ہے۔

شبیر کو قلق تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی بیوی اپنے شوہر (شبیر) کی نسبت اپنی ماں کی زیادہ سنتی ہے۔ شبیر اسے کم فرمانبردار کہتا تھا اور وہ دوسری شادی کا سوچ رہا تھا۔

اس تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ جو مستقل طور پر مروجہ مردانہ نظریات کو چیلنج کرتے ہیں۔ ان مردوں میں اندرونی تقابل اور تناؤ بھی پایا جاتا ہے۔ وہ مخلوط خصوصیات کے حامل نظر آتے ہیں یعنی ان کو واضح طور پر 'اچھا'، 'برا' مرد، تشدد کرنے والا، حساس یا صنفی برابری کا خیال رکھنے والا مرد جیسی گروہ بندیوں میں نہیں بیان کیا جاسکتا۔ مردانگی اور اس سے جڑی ہوئی توقعات دراصل معاشرتی سطح پر بُنی جاتی ہیں اور مرد اس سلسلے کو دورانِ پرورش اپناتے چلے جاتے ہیں۔ مردانگی کی یہ بُنت ذاتی تجربات، معاشرتی اقدار، مقامی کلچر، نسل، سماجی طبقہ، مذہب اور جغرافیہ سے متاثر ہوتی ہے۔
ایک بات تو واضح طور پر نظر آتی ہے کہ مردانگی کی توقعات پر پورا اُترنا ایک مشکل امر ہے۔ اس تحقیق میں بیان کیے گئے مواد سے یہ نظر آتا ہے کہ مرد ذاتی سطح پر مردانگی سے متعلقہ شناخت کے حوالے سے اندرونی انتشار کا شکار بھی ہوتے ہیں۔ یہ انتشار بسا اوقات جارحیت کی صورت عیاں ہوتا ہے تو کبھی بالکل اس کے برعکس شکل اختیار کرتا ہے جس کا ذکر آئندہ عنوان کے تحت کیا گیا ہے۔

مردوں کی زندگیاں اور مثبت اقدامات

اس تحقیق کا ایک بنیادی سوال یہ جاننا بھی تھا کہ شامل تحقیق مرد کس طرح کے اقدامات کو مثبت اقدام کے طور پر دیکھتے ہیں اور وہ جنسی تشدد کے خلاف آواز اٹھائے جانے والے اپنے مثبت اقدامات کو کس طرح بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ ان مثبت اقدامات کی وجہ سے انہیں ذاتی سطح پر شدید خطرہ اور نقصان کا اندیشہ تھا۔ بعض اوقات ان کے یہ خطرات مادی نوعیت کے تھے مثلاً جائیداد اور زندگی کے ضائع ہونے کا اندیشہ اور بسا اوقات یہ خطرات ذہنی دباؤ اور تناؤ کا سبب بنے۔ کیا یہ اقدامات روایتی تصورِ مردانگی سے ہٹ کر ہیں یا یہ کسی خاص تصورِ مردانگی کے محور میں ہی وقوع پذیر ہوئے۔
روزن کی طرف سے کی گئی ایک تحقیق میں نوجوان لڑکوں نے بتایا کہ وہ اپنے آپ کو ایسا گروہ تصور کرتے ہیں جنہوں نے معاشرے کے اقدار اور روایات کو آگے لے کر چلنا ہے۔ زیادہ تر نے ان خیالات کا اظہار خاندان کی عورتوں مثلاً ماں، بہن اور بیوی کے حوالے سے کیا کہ ان سے متعلقہ جو معاشرتی روایات ہیں وہ ان کو قائم رکھنے کے ذمہ دار ہیں۔ علاوہ ازیں قرب و جوار میں "برائی" کا خاتمہ بھی ان کی ذمہ داری ہے۔

حالیہ تحقیق میں بھی یہ بات منعکس ہوئی کہ مثبت اقدامات کرنے والے مرد بھی اس سوچ کے حامل تھے کہ بحیثیت محافظ، لڑنے والے اور معاشرتی اقدار کے نگران ان کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ متاثرہ افراد کی مدد کریں۔ یہ سوچ روایتی تصورِ مردانگی کا ہی حصہ ہے جو کہ طاقت کے بے جوڑ اور امتیازی تقسیم پر سوال نہیں اٹھاتا۔ پانچ میں سے تین لائف ہسٹریز اس دلیل کو تقویت بخشتی ہیں۔ ان تینوں مردوں کے نزدیک طاقت کا 'جائز' ہونا بہت ضروری ہے چاہے یہ طاقت نسلی بنیادوں، سرکاری عہدہ یا خاندان میں خاص اہمیت کی وجہ سے ہی کیوں نہ ہو۔ اکرام نے بڑے فخر سے بتایا کہ اس کے علاقے کے کتنے ہی مردوں نے آرمی میں شمولیت اختیار کی اور وہ بہت اچھے جنگجو ہیں۔ اسے اس بات پر بھی فخر تھا کہ کارگل میں شہید ہونے والے جوانوں میں کافی تعداد اس کے علاقے کے لوگوں کی تھی۔ اکرام کے نزدیک لیڈرشپ کرنے کی صلاحیت انتہائی اہم ہوتی ہے اور وہ بار بار اپنے خاندان اور قبیلے کے حوالے سے راہ نمائی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ مزید برآں اس نے مردوں کے خلاف جنسی تشدد کو انتہائی قبیح عمل قرار دیا اور اس کے نزدیک یہ عمل تشدد کی کسی بھی دیگر قسم سے زیادہ بُرا ہے۔ اس طرح اس نے واضح طور پر اشارہ دیا کہ وہ مردوں کے درمیان جنسی تعلق کو غیر فطری تصور کرتا ہے اور اس وجہ سے اسے انتہائی بُرا سمجھتا ہے۔

اکبر نے اپنے مثبت اقدامات کے بارے میں بتایا۔ اس نے کہا "پہلے میں ویسے ہی لوگوں کے کام کرتا تھا۔ جب وسائل آ گئے طاقت آ گئی تو زیادہ اچھے طریقے سے لوگوں کے کام آیا۔"
شبیر نے اختیار کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ "اپنے قبیلے میں بھی ہم دیکھتے تھے بچپن میں، وہیں سے شاید کچھ شوق پیدا ہُوا کہ کچھ سٹینڈرڈ کی پوزیشن میں جایا جائے جہاں لوگوں کے مسئلے حل ہو سکیں اور تھوڑا اسٹینڈرڈ بھی ہو بے شک آفیشل ہو یا کوئی پولیٹیکل پوسٹ وغیرہ"

درج بالا تینوں مردوں نے صریح ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی مگر ان تینوں کے معاملے میں کہیں بھی ایسا نہیں دکھائی دیتا کہ روایتی مردانگی کے تصور کے برخلاف کچھ کیا اور نہ ہی اس توقع کے برعکس تھا کہ ایک طاقت ور مرد کو کمزور کی حفاظت کرنی ہے۔ جبکہ اکرام کے معاملے میں اس کے اقدام کو معاشرہ نے بھی سراہا کیونکہ معاشرہ میں ہم جنسیت کے خلاف سخت نفرت پائی جاتی ہے۔ تاہم بیرونی دباؤ اور بعض اوقات خطرے کے باوجود شامل تحقیق مردوں نے اپنے اپنے طور پر ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائی۔ ایسی صورت حال میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جن مردوں نے مثبت اقدامات کیے وہ ان کے روایتی تصورِ مردانگی کی عکاسی کرتے تھے نہ کہ ان تصورات سے جڑی روایات سے انحراف۔ کچھ کیسز میں مرد عورتوں اور ان مردوں کے لئے جو ان کے نزدیک کمزور ہیں، محافظ کا کردار ادا کر رہے ہیں۔

تاہم جب کسی مرد نے ہیجڑے کے ساتھ زیادتی کے خلاف آواز اٹھائی تو روایتی تصورِ مردانگی اور اس امر کے مابین اختلافات نمایاں ہوئے۔ جب اکبر نے ان لوگوں (ہیجڑوں) کے دُکھ کو محسوس کرتے ہوئے اُن سے اظہارِ ہمدردی کیا تو اسے بذاتِ خود اندرونی طور پر غیر اطمینان بخش احساسات کا سامنا کرنا پڑا چونکہ وہ ہیجڑوں کے رہن سہن، اور ان کی

مذہب سے دوری کے تاثر کی وجہ سے ان کے ساتھ ملنے پر غیر مطمئن تھا۔ یہ احساس لوگوں کے رویے کی وجہ سے اور بھی شدید ہوجاتا جب بحیثیت سوشل ورکر اس کے کردار کو مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا۔ اس اندرونی تضاد اور بیرونی دباؤ نے اسے فیصلہ کرنے پر مجبور کردیا کہ وہ آئندہ اس گروہ کے ساتھ کام نہیں کرے گا۔

پانچوں مردوں نے جنسی طور پر متاثرہ افراد کی مدد یا دفاع کی جو کوششیں کی ہیں ان کا تعلق مردوں کی ذاتی حیثیت اور اختیار کے ساتھ واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ پانچ میں سے دو مرد نائب ناظم ہیں، تیسرے نے اپنے خاندان کی سماجی حیثیت کی طرف اشارہ کیا۔ چوتھا شخص کسی کمپنی کا سربراہ ہے۔ اسی طرح تمام شرکاء گریجوایشن ڈگری کے حامل ہیں اور بعض تو اس سے بھی زیادہ کوالیفائیڈ ہیں۔

مزید براں چار مردوں کی طرف سے جو اقدامات کئے گئے تھے ان اقدامات کو دوستوں اور ہم خیال لوگوں مثلاً انسانی حقوق کے لئے متحرک افراد کی مدد حاصل رہی۔ یہاں اس بات کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ان کے مثبت اقدامات کی اہمیت کو کم کیا جارہا ہے۔ ان مردوں نے جو اقدامات کئے اس دوران ان کی ذات کو خطرات کا سامنا رہا۔ تاہم یہ ذہن میں رہے کہ ان افراد کو ایسے مواقع میسر رہے جہاں یہ دوستوں سے مدد اور تائید حاصل کرسکیں۔

بہت ساری تحقیقات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ صرف کوئی ایک خاص طرح کی مردانگی نہیں پائی جاتی بلکہ مردانگی کی بہت ساری اقسام ہیں (کونل 2000 اور کورنوال 2003)۔ مردانگی جغرافیائی صورت حال، سماجی رتبہ، کلچر اور ذاتی تجربات سے متاثر ہوتی ہے۔

مختلف طبقہ ہائے سماج اور کلچر سے تعلق کی بنا پر ہمیں تمام شرکاء کے مثبت اقدامات کے بارے میں رائے اور اس سے جڑے ہوئے محرکات میں واضح فرق نظر آتا ہے۔ ہر خاص کلچر اور سماجی طبقہ سے تعلق رکھنے والے شریک نے مثبت اقدام کو مختلف تناظر میں دیکھا۔ اکبر نے اپنے مثبت اقدام کے محرکات بیان کرتے ہوئے اسے باچا خان کی تحریک اور پٹھانوں میں پائے جانے والی سماجی قدر-عزیزولی، سے جوڑا۔

پختون روایات میں کمزور کی مدد کرنا ایک نہایت احسن اور 'مردانہ' عمل ہے۔ شاکر اپنے مثبت اقدام کو رشتوں کو مناسب اہمیت دینے سے جوڑتا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی میں رشتوں کا خاص مقام ہوتا ہے جو کہ اس کے باپ نے کبھی نہیں جانا اور نہ ہی دیا۔

خاص نسلی اور لسانی گروہ سے تعلق اکرام کے لئے وجہ مثبت اقدام بنا۔ محمد علی کی ایک ایسی قومی تحریک کے ساتھ وابستگی

جس میں وہ لوگوں کے حقوق کے لئے آواز بلند کرتا ہے، بنیادی وجہ بنی کہ وہ جرگہ کے فیصلے کو چیلنج کرے اور مظلوم کا ساتھ دے۔ شبیر کے لئے غریبوں اور کمزوروں کی مدد کر کے معاشرہ میں اچھا مقام حاصل کرنا اور لیڈر بننا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

متاثرہ شخص کے ساتھ مردوں (شامل تحقیق) کے تعلق کی نوعیت اور مردوں کا متاثرہ افراد کی مدد کرنے اور ان سے بات کرنے کا طریقہ ان کی 'ضرر پذیری' (Vulnerability) کی سمجھ پر روشنی ڈالتا ہے۔ تین مردوں نے کہا کہ انہوں نے ایکشن کمزور لوگوں (خواتین، خوبصورت لڑکے) کی مدد کے لئے لیا۔ اسی طرح انہوں نے مجبور اور بے بس افراد (بیچڑے) کی مدد کی۔ ایک واقعہ کے دوران شبیر کے دفتر میں جب ایک مرد کولیگ نے سینئر عورت کی بات نہ مان کر اس کی تضحیک کی تو شبیر نے اس معاملے میں دخل دیا اور اپنے مرد کولیگ کو سمجھایا کہ وہ (عورت) پیشہ ورانہ طور پر اس سے سینئر ہے اور اسے (مرد) کو اپنی سینئر کی عزت کرنی چاہیے اور حکم ماننا چاہیے۔ مگر اس نے براہ راست عورت سے کوئی بات نہیں کی۔

شبیر اور اکبر نے بھی متاثرہ فرد کو خاندان کے ایک ممبر کے طور پر ڈیل کیا نہ کہ کسی ایک الگ فرد کی طرح۔ شبیر متاثرہ فرد کے حوالے سے بات کرتے ہوئے جمع کا صیغہ استعمال کرتا تھا۔ یعنی وہ جنسی زیادتی سے متاثرہ لڑکی کے تمام گھر والوں کو بھی متاثرین میں شامل کرلیتا تھا اور شاید یہ مردانہ نظریے کی نشاندہی کرتا ہے جہاں عورت کے ساتھ ہونے والا جرم صرف اس کو متاثر نہیں کرتا بلکہ پورے خاندان کی انا کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ مدد کرنے اور لینے والے کے تعلق کے درمیان کیا مضمرات ہوسکتے ہیں اور کس طرح سے دونوں کے مابین طاقت کا تعلق بنتا ہے۔ اس تعلق میں متاثرہ شخص بے اختیار ہوسکتا ہے اور مدد کرنے والا مدد کے سارے عمل کو "مردانہ" پیرائے میں دیکھ رہا ہوتا ہے۔ تاہم دونوں مردوں کے لئے 'متاثرہ فرد' بذات خود ایک انفرادی حیثیت رکھتا تھا اور انہوں نے متاثرہ فرد کے فیصلوں کا احترام بھی کیا۔ محمد علی نے مشکل اوقات میں متاثرہ فرد کا ساتھ دیا اور بسا اوقات زندگی کے کچھ ناخوشگوار فیصلوں میں بھی ساتھ دیا جو کہ بعد میں مشکل کا باعث بھی بنا۔ جبکہ شاکر نے واضح طور پر 'متاثرہ فرد' کو بااختیار بنانے میں کردار ادا کیا اور متاثرہ فرد کی مرضی کے مطابق اس کی مدد کی۔ شاکر نے 'متاثرہ' فرد کی ذاتی صلاحیتوں پر بھروسہ کیا۔ بہرحال یہ دونوں مرد روایتی مردانہ سوچ سے آگے بڑھے۔ اس سوچ میں جنسی تشدد کو ایسے جرم کے طور پر دیکھا جاتا ہے جس سے نمٹنے کا مردانہ طریقہ یہی ہوتا ہے کہ مردانہ وار انتقام لیا جائے اور کھوئی ہوئی عزت کو بحال کرایا جائے۔ اس سوچ کے نتیجہ میں ہوسکتا ہے کہ متاثرہ فرد پر دوسروں کا کنٹرول زیادہ ہوجائے اور اسے (متاثرہ) اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار نہ رہے۔
یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ شرکاء کی زندگیوں کے بیان سے جنسیات کے موضوع پر کچھ نہیں تھا۔ حتیٰ کہ جب محبت اور شادی وغیرہ کا ذکر ہوا تب بھی اس حوالے سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہماری سابقہ تحقیق (جو کہ نوجوان لڑکوں کے ساتھ تھی) میں لڑکوں کی باتوں سے جنسیات کا کافی تذکرہ ہوتا تھا۔ بہت سارے لڑکوں نے جنس کے بارے میں تجسس کے اظہار کے ساتھ ساتھ بچپن میں جنسی زیادتی کا شکار ہونے کا ذکر بھی کیا۔ ہمارے معاشرہ میں مرد اپنی زندگی کے اہم واقعات شیئر کرتے ہوئے اس پہلو (جنسی تشدد) کے بارے میں بات نہیں کرتے۔

ان مردوں کے کیے گئے مثبت اقدامات کسی تسلسل کے بغیر کوئی الگ سے واقعات نہیں تھے بلکہ یہ اس سلسلے کا حصّہ تھے جو کہ بچپن اور طالب علمی کے دور سے جاری ہے۔ بحیثیت ایک طالب علم محمد علی نے نا اہل اساتذہ اور انتظامیہ کے خلاف آواز اٹھائی تھی کہ کس طرح کچھ اساتذہ بچوں کو فلمیں دکھاتے اور پڑھاتے نہیں تھے۔ اس کی شکایت کے نتیجہ میں یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ اکرام زمانہ طالب علمی میں گورنر سے ملنے گیا اور اس سے درخواست کی کہ اس (اکرام) کے علاقہ کے لئے مخصوص کی گئی سیٹیں دوبارہ بحال کی جائیں۔ کچھ لوگوں کے لئے یہ اقدامات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ مثبت اقدامات کرنے والوں میں ساختی تشدد اور ناانصافیوں کے بارے میں آگاہی پائی جاتی ہے جو کہ محض صنفی ناانصافی تک محدود نہیں بلکہ انہیں مذہب، نسل، جاگیرداری اور طبقاتی ناانصافیوں کے بارے میں بھی پتا ہے۔

محمد علی نے کہا ''میں نیشنل جیوگرافک چینل، ڈسکوری، اینیمل پلانیٹ، جب بھی موقع ملتا ہے گھر پر دیکھتا ہوں۔ کس طرح جانور شکار کرتے ہیں اور کس طرح خود کو بچاتے ہیں، جینے کی ایک جنگ ہوتی ہے۔۔۔ تو انسان کو جب دیکھتا ہوں تو وہی جنگل کا قانون ہے، وہی جو طاقتور ہے اس کی۔۔۔ طاقت کی بنیاد ہی اس میں ہے کہ اپنے سے کمتر کو شکار کرے۔۔۔''

ایک اور موقع پر وہ بتاتا ہے کہ کس طرح مقامی مذہبی سمجھ اور اقدار میں مذہبی انتہا پسندی کے رجحانات نہیں ہیں۔ وہ کہتا ہے ''۔۔۔ یہاں (سندھ) کے جو لوگ ہیں وہ صوفی قسم کے لوگ ہیں، یہ مذہبی بنیاد پرستی ان سے بہت دور ہے۔ ابھی باہر کے آئے ہوئے لوگوں نے ہمیں شدت پسند بنا دیا ہے نوجوانوں کو، لیکن بنیادی طور پر سندھ اپنی اصل روح میں صوفی ہے۔۔۔''

ایک اور مقام پر محمد علی ذات پات کی بنیاد پر پائے جانے والی ناانصافی کی طرف اشارہ کرتا ہے: ''ایک کہانی مَیں نے لکھی تھی کہ ایک دفعہ دوسرے شہر سے آ رہا تھا تو دو نوجوان لڑکیاں بس میں سوار ہوئیں ان کو کنڈکٹر نے رش کے باوجود سیٹ بنا دی لیکن مَیں جب اُترا تو دیکھا کہ وہ دو بوڑھی عورتیں باگڑی (سندھ کی ایک ذات جسے کمتر تصور کیا جاتا ہے) عورتیں ہیں جو میرے ساتھ شہر سے میرے ساتھ چلیں تھیں وہ اب تک کھڑی تھیں پیچھے''

کچھ لوگوں کے لئے مدد کرنے کا محرک یہ تھا کہ اپنے سے کمزور لوگوں کی مدد کی جائے جبکہ بعض مدد کرنے والوں نے معاشرہ میں پائے جانے والے ساختی امتیاز کو سمجھتے ہوئے کمزور لوگوں کی مدد کرنے کا سوچا۔ بہرحال ان مدد کرنے والوں کے نزدیک محرکات کچھ بھی رہے ہوں مگر یہ بات واضح ہے کہ ان کے اقدامات کا تعلق صرف صنفی امتیاز تک محدود نہیں تھا۔

مردانگی کے حوالے سے تحقیق میں 'سلسلہ روزگار' اور 'کام کرنے کی جگہ' نہایت اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ دونوں باتیں اس لحاظ سے بھی زیادہ اہم ہو جاتی ہیں کہ یہ متبادل مردانگی کو پروان چڑھانے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ بیوٹی پارلرز مردانہ شناخت اور کام کے مابین تعلق کو سمجھنے کے حوالے سے اہم جگہیں ہیں (احمد)۔ اسی طرح گھریلو مرد ملازموں کے حوالے سے

مردانگی کا تجزیہ بھی ایک اہم جہت ہے (چوہڑا 2006)۔

پہلے سے طے شدہ خیالات کے مطابق پرکھنے کے بعد شرکاء کا انتخاب عمل میں لایا گیا (تفصیل کے لیے دیکھئے صفحہ 30 باب تحقیقی خاکہ) پانچ میں سے چار شرکاء کا براہ راست تعلق انسانی حقوق کے لئے کام کرنے والی تنظیموں سے ہے۔ یہ مردوں کے حوالے سے نیا انکشاف بھی ہے کہ انہیں جنسی تشدد سے متاثرہ افراد کی مدد کرنے کے لئے کام کی صورت میں موقع فراہم ہوا ہے۔

اکرام، محمد علی، شبیر اور اکبر بالواسطہ طور پر ایسی تنظیموں سے وابستہ ہیں جو کہ تشدد اور صنفی ناانصافی کے خاتمے اور انسانی حقوق جیسے موضوعات پر کام کر رہی ہیں۔ پانچواں شریک--شاکر، بالواسطہ طور پر ایسی تنظیموں سے منسلک ہے چونکہ اس کی بیوی ایک ایسی ہی تنظیم کے لئے کام کرتی ہے۔

NGOs میں کام کرنے والے مردوں کی شناخت ایک نئی صورت میں اُبھر رہی ہے۔ اس سیکٹر میں کام کرتے ہوئے وہ بہت ساری ایسی سرگرمیوں کا حصّہ بنتے ہیں جو کہ معاشرے میں پائے جانے والے تشدد بالخصوص خواتین پر تشدد سے متعلقہ ہوتی ہیں۔ یہ سرگرمیاں مردوں کی ذات پر اثر انداز ہونے کے ساتھ ساتھ بسا اوقات متضاد کیفیت بھی پیدا کرتی ہیں۔ اس سیکٹر میں شمولیت اختیار کرنے والے مردوں کو بہت سارے ہم خیال افراد کی مدد بھی ملتی ہے۔ یہ سیکٹر ایک منفرد کام کی جگہ کے طور پر مردوں کو پیشہ ورانہ چوائس مہیا کرتا ہے اور ساتھ ہی ایک مختلف طرح کی مردانہ شناخت کا سبب بھی بن رہا ہے۔

روایتی مردانگی سے انحراف کرنا اور اپنانا

بعض ایسی صورتیں موجود ہیں جو یا تو روایتی مردانگی کے تصور کو فروغ دیتی ہیں یا ان تصورات پر عمل پیرا ہونے میں رکاوٹ کا باعث بنتی ہیں۔ مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرد کبھی کبھی حالات سے مجبور ہو کر اپنے کرداروں کو مختلف صورتوں کے مطابق ڈھالتے ہیں (گروسن- گرین 2009، جاجی 2009)۔ مثال کے طور پر مردوں نے مہاجرین کیمپوں میں خواتین کو وہ کردار ادا کرنے کی اجازت دی جو کہ وہ شاید عام حالات میں نہ دیتے۔ البتہ ہماری تحقیق یہ کہتی ہے کہ بسا اوقات یہ مردوں کا شعوری فیصلہ بھی ہوتا ہے۔ ذاتی تاریخ مردوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور وہ مروجہ تصور مردانگی سے انحراف کرتے ہیں۔

اکرام نے بتایا کہ کس طرح اس نے سکول کے زمانہ میں تشدد دیکھا مگر اس نے اپنے بچوں کی تربیت کے لئے مختلف طریقہ اپنایا۔

''بچوں کو گائیڈ کرنا ہے تو ان کو بجائے physically torture کرنے کے زبانی طور پر سمجھانا ہے، مَیں بھی اپنے گھر کے اندر میری جو دو بیٹیاں ہیں وہ کوئی اس طرح کا کام کر دیتی ہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ وہ ڈسپلن کے خلاف ہے تو مَیں تھوڑا بہت اُن کو یہی کہتا ہوں کہ بابا یہ اس طرح نہیں ہوتا ہے میری کوشش رہی ہے کہ (وقفہ) مَیں اپنی بیٹیوں کے اُوپر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا''

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ہے کہ شاکر نے اپنے والد کے بارے میں بتایا کہ وہ رشتوں کو اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اس کے برعکس شاکر نے اپنی زندگی میں رشتوں کو اہمیت دی۔

ایسے بھی کیسز موجود ہیں جن میں مردوں نے صنفی سٹریوٹائپس کو چیلنج کیا اور ان کے خلاف ترقی پسندانہ رویہ اپنایا۔ اکبر نائب ناظم تھا اور اس کی بیوی کونسلر تھی۔ اکبر نے ایک مختلف کردار اپنایا ہوا ہے۔ وہ گھر پر رہتا ہے اور بچوں کی دیکھ بھال جیسے کام کرتا ہے جبکہ اس کی بیوی باہر کام کرتی ہے۔

''مَیں جہاں بھی ہوتا ہوں مَیں دو بجے سے پہلے اپنے گھر پہنچتا ہوں، مَیں اپنے بچوں کے لئے پہنچتا ہوں۔ اُن کو یونیفارم بدلواتا ہوں، کہیں جانا ہو تو بیوی کو بتا کے جاتا ہوں کہ آج مَیں نہیں ہوں گا، اسی طرح شام کو میں اُن (بیوی) کے ساتھ فل تعاون کرتا ہوں، بازار سے روٹی بھی لاتا ہوں کوئی مہمان آئے ہوں تو اُن حالات میں مَیں اُن کے ساتھ بھرپور تعاون کرتا ہوں''

بیوی کے کونسلر ہونے کی وجہ سے اسے دوستوں اور رشتہ داروں سے طعنے سننے اور تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اور کونسل کا سربراہ ہونے کی حیثیت میں اس نے اس ساری تنقید کا رد کر دیا اور کہا

'اللہ نے مجھے عزت دی ہے اور وہی اس کو (برقرار) رکھے گا'

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اکبر کی بیوی نے اکبر کے باپ کی تجویز پر الیکشن میں حصہ لیا۔ اکبر کب سے ایسے چاہتا تھا مگر باپ کے ڈر سے اس خواہش کو زبان پر نہیں لایا تھا کیونکہ اس کا باپ ایک روایتی قدامت پسند سوچ کا مالک تھا اور عورتوں کا گھر سے باہر جانا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔

شبیر نے اپنی فیملی میں اس بات پر زور دیا کہ لڑکیوں کو تعلیم دی جائے۔

''میرے بڑے بھائی کا بیٹا ہے یعنی میرا بڑا بھتیجا، تو وہ حالانکہ یہ ہمارے گھر میں ابھی فی میل زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہوں گی تو میٹرک یا ایف۔ اے تک تو لازمی ہیں، تو اُس کو ابھی بھی یہ ہے کہ فی میلز نہیں پڑھانی چاہیے۔ اُس کی ایک بہن ہے میری بیٹی (بھتیجی) کو ایڈمیشن دلانے کا ٹائم آیا تو اس نے مخالفت شروع کی کہ اِس کو نہیں پڑھانا چاہیے تو جیسے گھر کے اندر بڑا ہوتا ہے وہ اخلاقی طور پر اسے (چھوٹے کو) سمجھاتا ہے اور اگر وہ نہ سمجھے تو اسے فورس بھی کر دیتا ہے تو میں نے اس کو تھوڑا realize کروایا کہ پڑھانا چاہیے اسے، بہت بات ہوئی تب وہ مانا اور بھتیجی کا ایڈمیشن ہوا''

محمد علی نے اپنے دوست کی دشمنی کے باعث پہلے ایک بوڑھے شخص کو مارا مگر پھر اسے شدید ندامت کا احساس ہوا اور اس نے دوستوں کے اس گروہ کو چھوڑ دیا۔

''ایک دن میرے دوست نے کہا کہ ایک شخص کا میرے ساتھ جھگڑا ہوا ہے، وہ فلاں لوگ ہیں اور مجھے بدلہ لینا ہے۔ اس کام پہ مجھے آج بھی بہت پچھتاوا ہے۔ میرا وہ اتنا اچھا دوست تھا لیکن (وقفہ) مَیں نے کہا ٹھیک ہے یار کوئی مسئلہ نہیں، حکم کرو کیا کیا کرنا ہے اُس نے کہا کرنا کچھ نہیں بس اس کو موچڑے لگانے ہیں۔ اُس کو ٹھیک کرنا ہے، اُس نے ہمارے ساتھ یہ کیا ہے وہ کیا ہے۔ اُن کے کافی اختلافات تھے اور اُس نے کیس کیا تھا کوئی تو یہ گواہ بنا تھا اُس کے خلاف، مجھے آج بہت پچھتاوا ہے لیکن میں نے کیا (وقفہ) رات کو ہم نے کیا کیا کہ اس کے دروازے پر جا کے نوک (دروازہ بجانا) کیا، اس نے بنیان پہنی ہوئی تھی، جیسے ہی وہ باہر نکلا تو ہم دونوں اُس کو مارنا شروع ہو گئے بغیر کچھ سوچے سمجھے، ہم نے اس کو کافی مارا پیٹا ہم ناظم تھے پولیس والوں کے پاس وہ بھاگا لیکن اس بچارے کا کچھ نہیں ہوا، لیکن مجھے اتنا پچھتاوا ہے، مَیں پہلے تو اس کو نہیں جانتا تھا وہ ایک غریب انسان تھا''

''مَیں نے کہا یار ایسے ہی ہوتا ہے دوستی میں، سنگت میں کوئی مسئلہ نہیں تمہارے دشمن ہمارے دشمن حکم کرو، اِس طرح میں اس کی باتوں میں آ گیا، مَیں ابھی بھی کہتا ہوں کہ کسی دوست پر اگر مشکل وقت آئے گا تو میرا جو بھی حال ہوگا مَیں اس کے لئے مرنے کو بھی تیار ہوں لیکن ان چیزوں کو سوچنا چاہیے کہ دوست صحیح طور پر آپ کو (وقفہ)، غلط کام نہیں کرنا چاہیے اس کام پر مجھے ابھی بھی شرمندگی ہے تو اس کے بعد میں نے آہستہ آہستہ اُن سے دوری اختیار کر لی، مجھے کبھی کبھی فون کرتا ہے لیکن روایتی باتیں ہوتی ہیں''

محمد علی کو جب پتا چلا کہ اس کی محبت کسی اور کی ہونے جا رہی ہے تو وہ بہت دل برداشتہ ہوا مگر اس نے کسی طرح کا ہنگامہ نہیں کیا اور نہ ہی اس لڑکی کو کچھ کہا۔

ایسی کہانیاں بھی ہیں جن میں مردوں نے اپنی گھریلو زندگیوں اور تعلقات کے حوالے سے ایسے اقدامات کیے جو کہ مقامی مروجہ روایات سے متصادم تھے۔ درحقیقت ان مردوں نے اپنی زندگی میں جو تشدد دیکھا انہوں نے اس کے برعکس رویہ اپنایا۔ انہوں نے شعوری طور پر اس چیز کو چنا اور مروجہ قائدے سے انحراف کی کوشش کی۔

روایتی اقدار کو چیلنج کرنے میں مردوں کو بہت سارے دباؤ کا سامنا کرنا پڑا: مجرموں کی طرف سے خطرہ اور خاندان اور دوستوں کی طرف سے طعنے۔ شبیر کے بھائیوں نے اسے رضاکارانہ طور پر کام کرنے پر طعنے دیے اور اکبر کے ہیجڑوں کے حوالے سے کام کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ان مردوں نے پولیس، محکمہ صحت اور عوام کی طرف سے رکاوٹ کا باعث بننے اور حوصلہ پست کرنے والے برتاؤ کا سامنا کیا۔ اس دباؤ کا اندرونی پہلو بھی ہے۔ شاکر کو اپنے باپ کی علیحدگی کے بعد اس سے تعلق رکھنے میں مشکل پیش آئی۔ محمد علی نے ریپ کا نشانہ بننے والی خاتون کی مدد کرنے کے دوران پیش آنے والی مشکلات کا تذکرہ کیا۔

تشدد سے نمٹنے کے زیادہ تر طریقے روایتی مردانگی کے زمرے میں ہی آتے ہیں جس میں مسئلے کے حل کے لئے طاقت کا سہارا لینے کا رجحان غالب ہوتا ہے۔ طاقتور گروہوں سے وابستگی، متعلقہ شعبوں سے جڑے ہوئے دوستوں کی مدد لینا مثلاً صحافی، وکیل وغیرہ اور اپنے قبیلے کی شناخت کو نمایاں پہچان کے طور پر استعمال کرنا، وہ عوامل ہیں جو اس خاص سوچ کی عکاسی کرتے ہیں۔ اکبر ایسے دباؤ کا مقابلہ یہ سوچ کر کرتا ہے کہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے اور مقدر میں ایسا ہی لکھا ہے۔ اکبر کی یہ سوچ کہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے اسے دوستوں اور گھر والوں کے طعنے اور دشمنوں کے خطرات سے نمٹنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ علاوہ ازیں ایسی کہانیاں بھی ہیں جن میں مردوں نے 'غیر روایتی' طریقوں کا سہارا لیا۔ مثال کے طور پر محمد علی اپنی پریشانی اور اداسی کی حالت میں ماں کی قبر پر جا کر روتا ہے اور اپنا دل ہلکا کر لیتا ہے۔ وہ اپنی پسندیدہ گلوکارہ لتا منگیشکر کے گانے سننے کے ساتھ ساتھ تاریخ و ادب کی کتب کا مطالعہ بھی کرتا ہے۔ جبکہ شاکر اپنی فیملی کی مدد حاصل کرتا ہے اور ان کے ساتھ دُکھ شیئر کرنے پر انحصار کرتا ہے۔

پھر بھی ان تمام کہانیوں میں روایتی آراء سے گٹھ جوڑ یا قبولیت کا تذکرہ تسلسل کے ساتھ موجود ہے۔ کونل اس کو ''حاوی ہونے والی مردانگی'' کے ساتھ گٹھ جوڑ کے طور پر بیان کرتی ہے۔ مردانگی کی ایسی ساخت جو پدرسری نظام سے فوائد تو حاصل کرتی ہے لیکن اس نظام کے خلاف ''ہراول دستے کے سپاہی'' بننے کا خطرہ اور کھنچاؤ مول نہیں لیتی۔ ایسے مرد جو غالب مردانگی کے اصولوں پر تو عمل پیرا نہیں ہوتے مگر پدرسری سے فوائد حاصل کرتے ہیں ''مشارکتی مردانہ پن'' کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس طرح کے مرد بیٹیوں اور بیویوں کا احترام کرتے ہیں۔ عورتوں پر تشدد نہیں کرتے۔ گھریلو کام کاج کرتے ہیں لیکن عمومی پدرسری کے ضوابط کی مزاحمت نہیں کرتے اور نہ ہی ان فوائد سے پیچھے ہٹنے جو انہیں ایک مرد ہونے کے ناطے پدرسری نظام سے بن مانگے مل رہے ہیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ شرکاء نے مردانہ کردار کی دیگر خصوصیات کو اپنایا ہوا تھا۔ مثال کے طور پر کچھ شرکاء ہم جنسیت سے خوفزدہ تھے۔

اکبر جن معاشرتی ناانصافیوں کے خلاف کام کرتا ہے اس کے بارے میں اس نے کہا:

''کسی کے ساتھ بھی تشدد ہو مثلاً کسی لڑکے یا آدمی نے اپنی بیوی کے ساتھ ظلم کیا اُس کو اپنے گھر بھیج دیا ہے یا اُس کو وہ حقوق نہیں دے رہے ہیں تو ہم ان کے لئے بھی آواز اُٹھاتے ہیں یہ (جنسی تشدد کے واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے) تو پھر بھی میل (male) ہے، میل (male) کے لئے تو ہم سب کچھ کرتے ہیں آپ نے (جنسی تشدد کرنے والے کو مخاطب کرتے ہُوئے) جو کام کیا ہے وہ تو کرنے کے قابل نہیں ہے''

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ہے کہ کچھ مردوں کے لئے 'متاثرہ فرد' کی حیثیت ایک ایسے شخص کی تھی جو کہ اپنے لئے خود نہیں لڑ سکتا اور اسے اپنے حقوق کے حصول کے لئے کسی طاقتور فرد کے سہارے کی ضرورت ہے۔ جو کہ متاثرہ فرد کی مدد اور راہ نمائی کر سکے۔

ہماری تحقیق میں شامل مرد- شبیر، اپنی بیوی کے بارے میں روایتی سوچ رکھتا تھا اور اسے کم فرمانبردار سمجھتا تھا۔ وہ دوسری شادی کرنے کا سوچ رہا تھا مگر اپنے بچپن کے تجربات کی وجہ سے دوسری شادی سے گریزاں تھا۔ اسے یاد تھا کہ وہ باپ کی دوسری شادی کی وجہ سے باپ کی توجہ سے محروم ہو گیا تھا۔ شبیر نے واضح طور پر یہ بھی کہا کہ وہ اس بات کو اچھا نہیں سمجھتا کہ کوئی مرد دوسروں کے سامنے اپنے دُکھڑے روئے۔ مرد کو سب کچھ خود ہی سہنا چاہیے۔ شاکر نے ایماندارانہ طور پر شیئر کیا کہ اس نے اپنی بیٹی اور بیٹے کے لئے کس طرح الگ الگ قواعد بنائے ہیں اور مواقع فراہم کیے ہوئے ہیں۔ لڑکے لڑکی کو تعلیمی اعتبار سے، خاص طور پر بیرون ملک تعلیم کے حوالے سے، کم مواقع اور آزادی میسر ہے بہ نسبت لڑکے کے۔

''بیٹی اور بیٹے کے درمیان فرق میرے خیال میں رکھے گئے ہیں کیونکہ بیٹیوں کو ہم اس لئے زیادہ closely protected رکھتے ہیں، واچ کرتے ہیں اور بیٹوں کو بھی کرتے ہیں لیکن کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد، بیٹوں کو ہم زیادہ آزادی دے دیتے ہیں جیسے ہم نے بیٹے کو باہر بھیج دیا، اُنیس سال کی عمر میں۔ کہا جا کر پڑھو، بیٹی کو ہم اتنی آزادی سے نہیں بھیج سکتے کیونکہ ہمارا روایتی ایک سسٹم ہے کہ ہم نے یہ بھی دیکھنا ہے کہ بیٹا اور بیٹی نے اسی ماحول میں آگے پیچھے ہو کے فٹ ہونا ہے''

اکرام کے کیس میں تاخیر سے شادی کرنا بھی بنیادی طور پر بیوی کے لئے بہتر وسائل کی دستیابی کو ممکن بنانا تھا۔ انہوں نے شیئر کیا۔

''جب میں نے اپنا کیریئر کا آغاز کیا تھا سوشل ورک میں تو میری یہ کوشش تھی کہ (وقفہ) اگر میں جلدی شادی کروں گا تو لازم بات ہے کہ جب آپ شادی کرتے ہیں تو آپ کی ضروریات بڑھ جاتی ہیں اسی لئے میں نے جان بوجھ کے سوچا کہ میں تھوڑا لیٹ شادی کروں گا تا کہ اپنا سسٹم full fledge پوری طرح قائم کر لوں تو اس کے بعد شادی کروں گا چونکہ پھر چیزیں manage کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے''

حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مسلسل طور پر روایتی مردانہ تصورات سے ہم آہنگی اور دوری نظر آتی ہے۔ کسی موقع پر مرد روایتی تصور مردانگی سے انحراف کرتے نظر آتے ہیں تو کہیں ان تصورات سے جڑے سٹیریوٹائپس کو مضبوط کرنے میں کوشاں ہیں۔

ایک مختلف مرد کی تلاش

اِن مردوں کے تجربات اور زندگیوں سے ہم کیا نتائج اخذ کر سکتے ہیں؟ کچھ باتیں طالب علموں اور صنفی موضوع پر تحقیق کرنے والوں اور بعض باتیں عملی کام کرنے والوں کے لئے کارآمد ثابت ہوں گی۔ اس تحقیق کا تعلق صنفی کام میں مردوں کی شمولیت اور صنفیت سے متعلقہ پروگرامز کے خاکہ سے ہے۔

اصل میں تحقیق اور عملی کام کا گہرا تعلق ہوتا ہے: جو کچھ تحقیق سے پتا چلتا ہے اسے پریکٹس (عملی کام) میں شامل ہونا چاہیے۔ تاہم یہاں پر ہم نے پروگرامنگ کے حوالے سے کچھ پیچیدگیوں کا تذکرہ کیا ہے اور کچھ نئے تحقیقاتی موضوعات کی نشاندہی بھی کی ہے مگر یہ تقسیم مصنوعی ہے۔ تاہم ہم سمجھتے ہیں کہ ان دونوں پہلوؤں کے مابین گہرا ربط ہونا چاہیے۔
مردانگی کے روایتی تصور سے انحراف کرنا اور اس پر عمل پیرا بھی ہونا۔۔ یہ دو متضاد حقیقتیں ہیں جو کہ گزشتہ باب میں بیان کی گئیں۔ یہ حقیقتیں اس بات کی عکاسی کرتی ہیں کہ کس طرح ایک ہی مرد مختلف اوقات میں متبدل مردانگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

'صنفی طور پر حساس شخص کا تصور' اگر تضاد اور مختلف ہونے جیسی خصوصیات کی اجازت نہ دے تو یہ ایک مشکل کام ہوگا کہ کسی بھی ایسے مرد کی نشاندہی کی جا سکے جو کہ صنفی طور پر حساس ہو یا جسے ممکنہ طور پر صنفی تحریک میں شامل کیا جا سکتا ہو (نظریاتی یا معنوی سطح پر)۔ یہ عکاسی ان تمام پروگرامز کے لئے ہے جو کہ مردوں یا لڑکوں کو صنفی امتیاز کے خاتمے یا خواتین پر تشدد کے خاتمے سے متعلقہ کاموں میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ پروگرامز کا مختصر دورانیہ اس بات کا متحمل نہ ہو سکے کہ وہ مردانگی سے متعلقہ اِن تضادات پر اتنا غور کر سکیں۔ تاہم اس بات کی کوشش ضرور کرنی چاہیے کہ ان مردوں کی شناخت ضرور ڈویلپ ہو جو کہ NGO سیکٹر (جہاں پر صنفی فعالیت کا تصور مردوں کی شناخت سے جڑا ہوا ہے) سے جڑے ہوئے ہیں۔

اس تحقیق سے اس اہم بات کی بھی عکاسی ہوئی کہ مردوں کی زندگی میں ان پر بھی تشدد ہوتا ہے، ان پر کون تشدد کرتا ہے؟ کیسے کرتا ہے؟ وہ لڑکے اور مرد کی حیثیت میں کس طرح اس تشدد پر ردعمل کا اظہار کرتے ہیں؟ یہ سب باتیں بھی اس تحقیق سے نکل کر سامنے آئیں۔

بچپن سے بڑے ہونے تک تشدد دیکھنا اور سہنا ایک ایسا عنصر رہا جو کہ بالعموم دیکھنے میں آیا۔ اس عنصر نے مردوں کی ذات کی تشکیل پر بھی گہرے اثرات ڈالے۔ ہر شخص کی تشدد دیکھنے اور سہنے کی اپنی کہانی تھی۔ بعض لوگوں نے اپنی ذات پر اسے سہا تو بعض نے ماؤں اور اہلخانہ کے دیگر افراد کو اس کا نشانہ بنتے دیکھا۔ تشدد کی جگہیں اور اقسام متفرق رہیں۔ یہ تشدد سکول گراؤنڈ سے لے کر سیاسی و سماجی تشدد، گھریلو تشدد سے لے کر ریپ اور ڈکیتی تک پھیلا ہوا ہے۔
شامل تحقیق مردوں کی زندگیوں میں بچپن کے دوران، حتیٰ کہ بعض اوقات بعد کی زندگی میں بھی تشدد کی واضح جھلک نظر

آتی ہے جس کے اثرات اِن کی ذات کی تشکیل اور شخصیت سازی پر پڑے۔ تشدد یا تشدد کی دھمکی میں بال برابر فرق دیکھائی دیتا ہے۔ تشدد کی موجودگی حقیقی اور محسوس کی جانے والی ہے۔ پل میں یہ مرد تشدد کا نشانہ بنتے ہیں اور پل بھر میں ارتکاب جرم کرنے والے گروہ میں کھڑے نظر آتے ہیں اگرچہ یہ بعض اوقات ذاتی دفاع کی وجہ سے ہوتا ہے یا دوسرے مردوں کے اکسانے پر۔ کچھ مرد اپنے ایسے پُرتشدد رویے پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ اس تشدد سے نمٹنے کے لئے تیار کچھ مرد اپنے ایسے اقدامات کو مردانگی کو دوبارہ ثابت کرنے والے عمل کے طور پر دیکھتے ہیں۔

یہ تحقیق اس بات کی طرف بھی متوجہ کرتی ہے کہ مرد اور لڑکے بھی جنسی تشدد کا شکار ہو سکتے ہیں اور وہ اس حوالے سے آسان ہدف (Vulnerable) ہوتے ہیں۔ تحقیق یہ بھی بتاتی ہے کہ نظم وضبط سکھانے کا عمل کس طرح سے مردوں کے لئے انتہائی متشدد اور سخت ہوتا ہے۔ ڈیٹا اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ مردوں کا تشدد سے متاثرہ ہونے کے تعلق کو سمجھا جائے۔ ان مردوں کے نزدیک متاثرہ افراد کی تعریف مختلف ہے جسے یہ بے بس، کمزور، احمق یا شریف کہتے ہیں۔ مردوں کے لئے آفت رسیدگی اور اس کے ساتھ جڑے درد کو محسوس کرنا اور ماننا ایک مشکل کام ہے اور یہ کام وہی مرد کر سکتے ہیں جو رائج الوقت مردانگی کے نظریے سے انحراف کرتے ہوں جس کے لئے بعض مرد تاحال تیار نہیں ہیں۔ حالانکہ وہ واضح طور پر تشدد سے متاثرہ ہیں مثال کے طور پر ریپ کی صورت میں، گھریلو تشدد، سکول میں جسمانی تشدد، فرقہ ورانہ فسادات، لسانی بنیادوں پر کی جانے والی متشدد سرگرمیاں اور ڈکیتیوں کا سامنا کرنے کی صورت میں وہ اس عمل کا شکار رہتے ہیں۔ ان تجربات کو ایسے محرکات کے طور پر دیکھا جانا چاہیے کہ کس طرح مرد طاقت اور اس کے غلط استعمال کو سمجھتے ہیں اور کمزور طبقات پر تشدد کے خلاف ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔

انسان جب دوسروں کی آفت رسیدگی کو محسوس کرتا ہے تو انسان کے اپنے بے بسی اور بے کسی سے جڑے جذبات اُبھر آتے ہیں اور اگر یہ احساسات کسی ایسے تجربے سے منسلک ہوں جو کہ تکلیف دہ اور بُرا ہو تو یہ دوسروں کے ساتھ جڑنے میں رکاوٹ کا باعث بنتا ہے۔

اس تحقیق سے ایک اور قابل ذکر نقطہ یہ بھی نکل کر آیا کہ کس طرح مشکل اور تکلیف کا سامنا 'بہادری' سے کیا جاتا ہے اور زخموں اور درد کو کم کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ کس طرح مرد اپنے آپ کو جذباتی و جسمانی درد سے دور رکھنے (ظاہر نہ کرنے) کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ چیز ان میں مردانگی کے روایتی تصور کو پروان چڑھانے کے لئے ضروری ہوتی ہے اور یہ قبائل، لسانی و مذہبی گروہ اور/یا قومی ریاستوں کی دین ہوتی ہے جن کے نزدیک مرد قربانی کی علامت، کمزور طبقات کا محافظ اور زمین کا رکھوالا ہوتا ہے۔ اس خاص تناظر میں مردوں کی آفت رسیدگی کو سمجھنا مردانگی کے روایتی نظریے کو چیلنج کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ مزید برآں یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ مردانگی کے معیارات ایک ہی جیسے مردوں میں تناؤ کا باعث بھی بنتے ہیں۔ متفرق اور باہم جڑے ہوئے غیر مساوی سماجی تعلقات بھی 'شناخت' پیدا کرتے ہیں۔ مردوں کا پدرسری نظام سے تعلق بھی انتہائی پیچیدہ ہے جہاں انہیں فوائد کے حصول کے

ساتھ ساتھ بھاری قیمت بھی چکانی پڑتی ہے۔

یہ تحقیق ان لوگوں کے لئے اہم ثابت ہوگی جو کہ صنفی برابری اور خواتین پر تشدد کے خاتمے کے حوالے سے مردوں کے ساتھ کام کرنے کے خواہش مند ہیں۔ یہ پروگرامز مردوں کو صرف بحیثیت طاقت ور اور بااختیار دیکھتے ہیں۔ اور ان مردوں کو بحیثیت 'متاثرہ' فرد کے نظر انداز کرتے ہیں۔ یہ تحقیق مردوں کی 'متاثرہ' حالت کو بھی ظاہر کرتی ہے اور تشدد سے جڑے (متاثرہ) ہوئے ان کے تجربات کی عکاسی بھی کرتی ہے۔ ایسے تعلقات کو سمجھنے سے ہم معاشرے میں پائے جانے والی تشدد کی بہت سی اقسام کو سمجھ سکتے ہیں جو کہ ہمارے معاشرے میں ساختی تشدد سے جڑی ہیں۔

اگر ہم مردوں کے تجربات کی روشنی میں ان محرکات اور تعلقات کو سمجھ سکیں جو کہ مردوں کو ارتکاب جرم کرنے والوں کی فہرست کے ساتھ ساتھ تشدد سے متاثرہ افراد کی گروہ بندی میں بھی ڈالتے ہیں تو ہم تشدد کے بارے میں نہایت اہم باتیں سمجھ جائیں گے۔ بصورت دیگر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم ان باتوں کو نہ سمجھیں اور روایتی سٹریوٹائپس کو فروغ دیتے جائیں جو کہ مردوں کو حفاظت کرنے والوں کے روپ میں دکھاتے ہیں اور انہیں اس میں مراعات بھی ملتی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مردوں کا 'حفاظت کرنے والے' کردار کو چیلنج کیا جائے ورنہ ہم ان کے دائرہ اختیار کو بے جا وسعت دیتے جائیں گے جو کہ خواتین کے استحصال کی صورت میں ظاہر ہوگی۔

عمومی طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بچوں کو مخصوص صنفی شخصیات میں ڈھالنے کا کردار مائیں نبھاتی ہیں۔ مگر حقائق اس کے برعکس بتاتے ہیں۔ مردوں کا اپنے باپ کی تعریف وتوصیف کے ساتھ ساتھ ان کے بعض اعمال پر سوالات اٹھانا اور ان سے 'لاتعلقی' کا اظہار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ باپ کس حد تک بچوں (لڑکوں) کی شخصیت سازی میں کردار ادا کرتا ہے۔ ہماری کہانیوں سے اس بات کی عکاسی ہوتی ہے کہ پانچوں مردوں کی زندگیوں پر باپ اور ان کی سرگرمیوں کے کتنے اثرات ہیں حتیٰ کہ یہ مرد بعض اوقات اپنے باپ کے اعمال سے اختلاف بھی رکھتے تھے۔ (یہ نقطہ باپ کے ساتھ کام کرنے حوالے سے انتہائی اہم ہے)۔ ان کا کردار بحیثیت باپ بچوں کی زندگیوں کو متاثر کرتا ہے اور انہیں مخصوص صنفی شخصیات میں ڈھالتا ہے۔

پانچوں مرد مقامی کلچر اور سیاق وسباق رکھتے تھے۔ ان کی مخصوص سماجی حیثیت بنانے میں ان کا سماجی رتبہ، شہری/دیہی بیک گراؤنڈ اور مختلف سماجی وسیاسی عوامل سے وابستگیوں کا اہم کردار رہا۔ ان کے مثبت اقدام کی تعریف ہر ایک کے سیاق وسباق کے مطابق تھی۔ ان میں سے بعض مردوں کے مثبت اقدامات کی پذیرائی مقامی روایات اور اقدار سے بھی ہوتی تھی مگر بعض مردوں کے معاملے میں صورت حال ایسی نہیں تھی۔ کسی خاص پروگرام کو ترتیب دینے سے پہلے یہ انتہائی ضروری ہے کہ مردانگی کا مطالعہ مقامی کلچر کے تناظر میں ضرور کیا جائے اور مختلف کلچرز میں مردانگی کے حوالے سے مختلف اور مشابہتی پہلوؤں کی نشاندہی بھی کی جائے۔

کچھ شرکاء کے لئے مثبت اقدامات سے مراد قانونی اقدامات ہیں اور عوامی احتجاج اس کا لازمی حصّہ۔ دوسروں کے لئے ادارہ جاتی سطح پر تبدیلی ہی مثبت اقدام کی عکاسی کرتی ہے۔ بعض افراد کی زندگیوں میں مثبت اقدام نے ایسی سرگرمیوں کی صورت اختیار کر لی جو کہ وہ غیر سرکاری تنظیموں کے توسط سے کرنے لگے۔ اس تمام تر تقسیم سے ماورا، تمام لوگوں کے نزدیک مثبت اقدامات نے معاشرے میں پائے جانے والی ناانصافیوں کے خلاف آگاہی پیدا کی۔ یہ اقدامات ان امتیازی رویوں کے خلاف تھے جو کسی بھی صورت میں پائے جاتے ہیں بشمول مذہبی، لسانی، نسلی، طبقاتی امتیازات کے۔ تاہم ان اقدامات کے تجزیہ کی گہرائی میں اختلاف ہوسکتا ہے۔

اس تحقیق سے یہ بات سامنے آئی کہ مثبت اقدامات صرف 'روایتی' صنفی نوعیت کے کیسز تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ وسیع بنیادوں پر سماجی مسائل کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ حاصل کردہ یہ نتائج اس تحقیق کی اہمیت کو مزید نمایاں کرتے ہیں۔ اور سماجی تبدیلی کے لئے بنائے گئے پروگرامز کے حوالے سے بھی اہم راہ نمائی کرتے ہیں۔ سماجی پروگرامز عموماً محدود موضوعات کو فوکس کر رہے ہوتے ہیں (حساسیت اجاگر کرنے والی ورکشاپس میں صرف صنف تک محدود رہنا وغیرہ)۔
اب اس بات پر بھی بحث جاری ہے کہ سماجی تبدیلی کے لئے بنائے گئے وہ پروگرامز جو ذاتی زندگی میں تبدیلی کی بات کرتے ہیں انہوں نے معاشی اور معاشرتی اداروں میں سیاسی تبدیلی کے عنصر کو کیونکر شامل نہیں کیا (گریگ، ایلن، اوٗسٹروم، بارکر)۔ زیادہ تر مردوں کے لئے مثبت اقدامات ذاتی زندگی سے باہر سماجی اور سیاسی زندگی سے جڑے ہوئے تھے۔ مثال کے طور پر کسی جرگہ کے فیصلے یا علاقے کے وڈیرے کو چیلنج کرنا یا اپنے کسی کولیگ کو جنسی رویے پر ٹوکنا۔ ایسی صورت حال میں ممکن ہے کہ یہ تبدیلی ذاتی سطح پر منعکس نہ ہو۔ مردوں کی زندگی میں اس Trajectory کا کھوج لگانا مشکل ہے کہ کس طرح مرد صنفی برابری کی طرف آتے ہیں (ذاتی سے سیاسی زندگی یا سیاسی سے ذاتی زندگی کی طرف)۔ یہ تبدیلی کسی بھی سمت میں ہوسکتی ہے اور یک سمت ہونے کے برعکس دائرہ کی صورت میں بھی ہوسکتی ہے۔ بہرحال واضح رہے کہ سیاسی اور ذاتی زندگیاں آپس میں جڑی ہوتی ہیں۔

آخر میں اس بات کو دہرانا نہایت ضروری ہے کہ اس تحقیق میں شامل مردوں کے مثبت اقدامات ہرگز اس بات کا عکس نہیں کہ وہ صنفی برابری کے لحاظ سے مکمل ہیں اور انتہائی حساس مرد ہیں۔ ان کی زندگیاں اور تجربات ظاہر کرتے ہیں کہ کس طرح وہ روایتی مردانگی کے تصورات کو چیلنج کرنے اور ان سے انحراف کرنے کے ساتھ ساتھ انہی تصورات کا حقیقتاً عملی مظاہرہ بھی کرتے ہیں اور روایتی تصور مردانگی کے فروغ کا باعث بھی بنتے ہیں۔ یہ دو پیچیدگیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے: اوّل، مردانگی کے بنیادی تصورات میں واضح فرق اور تضادات پائے جاتے ہیں اور مردانگی متفرق اور نسبتی (Relational) پہچان رکھتی ہے (کورنوال، 1994) اور یہ ناقابل تغیر نہیں ہے، دوم، یہ تفرقات ایک مستقل عمل کے طور پر جاری رہتے ہیں۔
جہاں ہمیں مردانگی سے جڑے ان تصورات سے دوری نظر آتی ہے وہاں مقامی تصور مردانگی سے جڑی سرگرمیاں نظر آتی

ہیں۔محاوراتی ''اچھا'' یا ''برا'' مرد کی تلاش میں ہم شاید بہت سارے مردوں کو چھوڑ جائیں یا انہیں ایک طرف کر دیں۔ اس طرح ہم ان تمام پیچیدہ صورت حال کو بھی نظر انداز کر دیں گے جس میں مرد خاص پس منظر کی وجہ سے مختلف اقسام کے تعلقات استوار کرتے اور خاص سرگرمیوں کا حصہ بنتے ہیں (کورنوال، 2003)۔

ضمیمہ جات

ضمیمہ۔الف

معلوماتی خط

اپریل 2011

حوالہ نمبر:

بنام:

ا۔ب۔ج

عنوان: ایسے مردوں کی نشاندہی کرنا جنہوں نے خواتین، بچوں یا دیگر مردوں پر ہونے والے جنسی تشدد کے خلاف مثبت اقدام کیا ہو۔

روزن کی طرف سے سلام!

روزن ایک 'صفاتی تحقیق' کر رہا ہے جس کا بنیادی مقصد پاکستانی تناظر میں ایسے مردوں کی زندگیوں کے تجربات کو کھوجنا اور تجزیہ کرنا ہے جنہوں نے خواتین، بچوں یا دیگر مردوں پر ہونے والے جنسی تشدد کے خلاف مثبت اقدام کیا ہو۔

روزن ایک غیر سرکاری تنظیم ہے جو کہ جذباتی و نفسیاتی صحت، صنف اور نوجوانوں کی نفسیاتی و تولیدی صحت جیسے اہم موضوعات پر کام کر رہی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ روزن خواتین اور بچوں پر ہونے والے تشدد کے خلاف بھی سرگرم عمل ہے۔

متذکرہ تحقیق کے لئے مطلوبہ مردوں کی نشاندہی میں آپ کی مدد درکار ہے۔یہ تحقیق ان مردوں اور لڑکوں کی زندگیوں کا تجزیہ کرے گی جنہوں نے درج ذیل حوالوں سے کبھی کوئی مثبت اقدام کیا ہو:

- ☆ قانونی اقدام
- ☆ روایتی قوانین کو چیلنج کرنا
- ☆ خاندانی سطح پر یا خاندان سے باہر کسی فیصلے کو چیلنج کیا ہو
- ☆ پالیسی سازی کی ہو یا اس کے لئے تجاویز دی ہوں

شرکاء کے انتخاب کے لئے درج ذیل باتوں کو مدنظر رکھا جائے گا:

- ☆ مرد/لڑکے جن کی عمر 18 سال یا اس سے زائد ہو
- ☆ کم از کم ایک مثبت اقدام کیا ہو

ممکنہ شرکاء کے انتخاب کا عمل درج ذیل مراحل پر مشتمل ہوگا:

1۔ پہلے مرحلے میں براہ راست روزن کے ذریعے ایسے لوگوں کو ڈھونڈا جائیگا (روزن کے پروگرام جو کیسز دیکھتے ہیں) یا بالواسطہ طریقوں سے ڈھونڈا جائیگا (دوسری غیر سرکاری تنظیمیں اور نیٹ ورکس)۔

2۔ ممکنہ شرکاء کے ساتھ ایک ابتدائی انٹرویو کیا جائے گا تا کہ ان کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل کی جا سکیں اور ان کے مثبت اقدام کے بارے میں جانا جا سکے۔

3۔ طے شدہ معیارات کے مطابق شرکاء کی چھانٹی کرنا

4۔ لائف ہسٹری طریقہ کو استعمال کرتے ہوئے منتخب کردہ شرکاء سے تفصیلی انٹرویو کرنا۔اس مقصد کے لئے شرکاء کے ساتھ ٹھہرنا بھی پڑ سکتا ہے اور انٹرویوز کی تعداد ایک سے زائد بھی ہو سکتی ہے۔

5۔ تحقیق کا حصہ بننے پر شرکاء کا شکریہ ادا کرنا

براہ مہربانی اس معلوماتی خط کے ساتھ ساتھ لف کیے گئے ''تحقیق کا مختصر تعارف'' کو متعلقہ افراد اور گروہوں کو بھیجیں۔ آپ کی تنظیم براہ راست بھی ایسے لڑکوں/مردوں کی نشاندہی کرسکتی ہے۔ اس حوالے سے آپ معلوماتی خط میں دیے گئے نمبر یا ای میل ایڈریس پر رابطہ کرسکتے ہیں۔

اس بات کا خیال رکھیں کہ متذکرہ تحقیق کے لئے نامزدگی موصول ہونے کی آخری تاریخ 21 جون 2011 ہے۔ لہذا جتنی جلدی ممکن ہوسکے اس معلوماتی خط کو تقسیم کریں۔

آپ کی مدد اور شرکت پر ہم شکرگزار ہوں گے۔

اسسٹنٹ پروگرام آفیسر روزن

پروگرام کوآرڈینیٹر روزن

ضمیمہ الف - A

تشدد کے خاتمے کا سفر
(مردوں کی جدوجہد)

روزن ایک غیر سرکاری تنظیم ہے جو کہ معاشرے میں خواتین اور بچوں پر ہونے والے تشدد کے خلاف کام کررہی ہے۔ اس کے علاوہ روزن نوجوانوں کی ذہنی وتولیدی صحت کے حوالے سے بھی کام کرتی ہے۔ روزن کا ایک شعبہ خاص طور پر مردوں کے ساتھ کام کررہا ہے، جس کا نام ہمقدم ہے۔

یہ شعبہ ایک تحقیق کرنے جارہا ہے جس کا بنیادی مقصد ان مردوں اور نوجوان لڑکوں کی زندگی کے تجربات کو سمجھنا اور ان سے سیکھنا ہے کہ جنھوں نے مردوں، عورتوں اور خواجہ سراؤں پر جنسی تشدد کے خلاف مثبت عملی اقدامات کئے ہیں (خواہ اقدامات چھوٹے ہوں یا بڑے، ذاتی یا معاشرتی زندگی میں)۔ ایسے اقدامات کرنے والے افراد کے احساسات کو سمجھنا اور اس عمل کے دوران پیش آنے والی مشکلات کا تجزیہ بھی اس تحقیق کے ضمنی مقاصد میں شامل ہے۔

ہم اپنی روزمرہ زندگی میں دیکھتے ہیں کہ آئے روز تشدد کے واقعات اور معاشرتی ناانصافیوں میں اضافہ ہوتا جارہا ہے اور عام طور پر اس طرح کی ناانصافیوں کے اثرات کمزور طبقات میں زیادہ ہوتے ہیں۔

ان حالات میں تشدد اور معاشرتی ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھانا بلاشبہ شدید معاشرتی مزاحمت اور دیگر مشکلات کو جنم دے سکتا ہے۔ اس تحقیق کے دوران ہم ایسے باہمت مردوں اور نوجوان لڑکوں سے بات کریں گے، جنہوں نے معاشرتی مخالفت کے باوجود جنسی تشدد کے خلاف نہ صرف آواز اٹھائی بلکہ مدد کی خاطر مثبت عملی اقدامات بھی کئے۔ اس تحقیق میں ہم نہ صرف یہ جاننا چاہیں گے کہ انھوں نے کیسے عملی اقدامات کئے، بلکہ ان اقدامات کے محرکات کو جاننا بھی اہم ہوگا کہ انھیں کیسی مشکلات اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔

ہم یقین رکھتے ہیں کہ ایسے مرد اور نوجوان لڑکے جنہوں نے اپنی زندگی کے دوران عورتوں، خواجہ سراؤں اور دیگر مردوں پر جنسی تشدد کے خلاف آواز اٹھائی وہ قابل صد تحسین ہیں۔ اگر آپ بھی ان مردوں اور نوجوان لڑکوں میں سے ایک ہیں کہ جنہوں نے مردوں، عورتوں اور خواجہ سراؤں پر جنسی تشدد کے خاتمے کے لئے اقدامات کیے تو ازراہ مہربانی اس نمبر پر رابطہ کریں یا اس ای میل ایڈریس پر ہمیں ای میل بھی کرسکتے ہیں۔

مزید معلومات یا سوالات کے لئے کسی بھی وقت رابطہ کرسکتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہے:۔

رابطہ نمبر:

0336-5989973

ای میل:

men4change@rozan.org

ضمیمہ-ب

سکریننگ گائیڈ لائنز

آپ کہاں سے بات کررہے ہیں؟

(جو بھی کال آئے تو اسے آپ کال بیک کریں)

جس سے بات کرنا چاہ رہے ہیں اس کو بتادیں کہ ممکنہ کتنی دیر کی کال ہوسکتی ہے۔ اگر اس کے پاس اتنا وقت نہ ہو تو اس سے کوئی مناسب وقت طے کرلیں

میں روزن سے بات کررہا ہوں۔ سب سے پہلے میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ آپ نے ہمارے ساتھ رابطہ کیا۔

میں گفتگو کو آگے بڑھانے سے پہلے اپنے بارے میں بتادیتا ہوں۔ میرا نام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے اور میرا تعلق روزن سے ہے۔

روزن ایک غیر سرکاری تنظیم ہے جو کہ معاشرہ میں خواتین اور بچوں پر ہونے والے تشدد کے خلاف کام کررہی ہے۔ اس کے علاوہ روزن نوجوانوں کی ذہنی وتولیدی صحت کے حوالے سے بھی کام کرتی ہے۔ روزن کا ایک شعبہ خاص طور پر مردوں کے ساتھ کام کرتا ہے۔ اس کا نام ہمقدم ہے۔

یہ شعبہ ایک تحقیق کرنے جارہا ہے جس کا بنیادی مقصد ان مردوں کے زندگی کے تجربات کو سمجھنا اور ان سے سیکھنا ہے جنہوں نے مردوں، عورتوں یا خواجہ سراؤں پر جنسی تشدد کے خلاف مثبت اقدامات کیے (خواہ وہ اقدامات چھوٹے ہوں یا بڑے)۔

اسی حوالے سے ہم نے ایک معلوماتی خط بھی ترتیب دیا اور مختلف لوگوں کو بھیجا ہے۔ کیا میں یہ جان سکتا ہوں کہ آپ تک یہ معلومات کس ذریعہ سے پہنچیں؟

آپ نے اس خط کو پڑھا؟

آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا (اگر خط پڑھا تو۔ ورنہ خود بتادیں) کہ ہم ان مردوں کے ساتھ تحقیق کررہے ہیں جنہوں نے عورتوں، خواجہ سراؤں یا دیگر مردوں پر جنسی تشدد کے خلاف کوئی اقدامات کیے۔ ایسے عملی اقدامات کے محرکات اور ایسے افراد کے ساتھ معاشرہ کے رویے کو سامنے لانا بھی ہے۔

اس حوالے سے آپ کے ذہن میں اگر کوئی سوال ہو تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اگر آپ تھوڑا سا ہمیں بتاسکیں کہ آپ نے کس قسم کے اقدامات کئے؟

اس تحقیق کی ضرورت ہے کہ ہم آپ کے ساتھ تفصیلاً بات کریں اور کچھ وقت آپ کے ساتھ گزاریں

(بتادیں کہ جولائی سے کب تک کا وقت ہوگا)

آپ کے خیال میں اس کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے اور کیا آپ اتنا وقت نکال پائیں گے؟

آپ نے خط میں بھی پڑھا ہوگا (اگر پڑھا ہے تو ورنہ جو شروع میں جواب آیا اس کی روشنی میں پوچھیں) کہ اس تحقیق میں شمولیت رضاکارانہ طور پر ہوگی۔ یعنی اس میں شامل ہونے والے مردوں کو مالی طور پر کوئی فائدہ نہیں دیا جائے گا۔

ایک اور بات واضح کرنا چاہوں گا کہ دوران تحقیق آپ سے جو بھی گفتگو ہوگی اور معلومات آپ ہمیں دیں گے وہ صرف اس تحقیق کے لئے استعمال ہوں گی۔ آپ کا نام یا کسی بھی قسم کی شناخت کسی کے بھی سامنے ظاہر نہیں کی جائے گی اور یہ معلومات صرف تحقیق کرنے والی ٹیم تک محدود رہیں گی۔

(یہاں ان سے ریکارڈنگ کی اجازت بھی لے لیں اور منتخب ہونے یا نہ ہونے کا طریقہ کار اور مزید کارروائی کے بارے میں بھی آگہی دے دیں)

ضمیمہ - بA

کیس سمری شیٹ

نمبر شمار	تفصیل	کیفیت
1	نام	
2	عمر	
3	علاقہ	
4	تعلیم	
5	ذات، رتبہ	
6	معلومات کے ذریعہ	
7	رسائی	
8	کس کے لیے مثبت اقدام کیا گیا (مرد/عورت/خواجہ سرا)	
9	اقدام کی قسم	
10	اقدام کا مختصر بیان	
11	معلومات کا درجہ	
12	معلومات شیئر کرنے میں کوئی مشکل تو نہیں	
13	ممکنہ درکار وقت	
14	تحقیق کے بارے میں واضح ہے	
15	مالی مفادات	
16	تجزیہ	

ضمیمہ-ج

اجازت نامہ

برائے شمولیت ہمقدم تحقیق

میرا نام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے اور یہ میرے ساتھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہیں۔ ہمارا تعلق ایک غیر سرکاری تنظیم روزن سے ہے۔ جو کہ اسلام آباد میں واقع ہے۔ روزن صنف، خواتین اور بچوں کے خلاف تشدد اور نوجوانوں کی نفسیاتی و تولیدی صحت جیسے اہم موضوعات پر کام کر رہی ہے۔ ہمقدم روزن کا ایک پروگرام ہے جو کہ معاشرہ میں صنفی برابری اور صنفی تشدد کے خاتمے میں

نوجوان لڑکوں اور مردوں کی شمولیت کو یقینی اور مؤثر بنانے پر کام کر رہا ہے۔ اسی سلسلے میں ہمقدم ایک تحقیق کرنے جا رہا ہے جس کا بنیادی مقصد، ایسے مردوں اور نوجوان لڑکوں کی زندگی کے تجربات کو سمجھنا اور ان سے سیکھنا ہے کہ جنہوں نے مردوں، عورتوں یا خواجہ سراؤں پر جنسی تشدد کے خلاف مثبت اقدامات کیے ہیں (خواہ یہ اقدامات چھوٹے ہوں یا بڑے، ذاتی یا معاشرتی زندگی میں ہوں)۔ ضمنی مقاصد میں ان اقدامات کے محرکات اور ایسے افراد کے ساتھ معاشرہ کے رویے اور ردعمل کو سامنے لانا بھی ہے۔

طریقہ کار:

سب سے پہلے محققین آپ کو اپنے بارے میں کچھ معلومات فراہم کریں گے۔ پھر تحقیق اور اس کے مقاصد سے آگاہ کیا جائے گا۔ آپ کی رضامندی کی صورت میں گزشتہ زندگی کے بارے میں سوالات کیے جائے گے۔ اس سوالنامے میں آپ سے مندرجہ ذیل کے بارے میں پوچھا جائے گا:

بچپن کے واقعات

گھریلو زندگی میں ماں، باپ، بہن، بھائی اور رشتے داروں کا کردار

جنسی تشدد کے بارے میں واقعات وخیالات

تشدد کے واقعات پر معاشرہ کا ردعمل

معاشی ومعاشرتی زندگی پر اثرات

مردوں کا معاشرہ میں عورتوں مردوں، اور خواجہ سراؤں کے خلاف ہونے والے جنسی تشدد کے خلاف اقدامات و کردار

ایسے مردوں سے معاشرے کی توقعات اور ان پر اس کا دباؤ

نقصانات:۔

اس تحقیق میں شامل ہونے پر آپ کو کم سے کم نقصانات ہیں۔ اس سوالنامے کے ذریعے آپ ہم سے اپنی ذاتی معلومات کا تبادلہ بھی کر سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کچھ سوالات کے جواب میں آپ جھجک اور پریشانی محسوس کریں۔ ایسے کسی سوال پر اگر آپ چاہیں تو جواب نہ دیں۔

فوائد:۔

اگرچہ کہ فوری طور پر آپ کو اس سے کوئی فوائد نہیں ہوں گے۔ اس تحقیق کی کامیاب تکمیل پر جب مردوں کی جانب سے صنفی تشدد کے خاتمے کے لئے عملی اقدامات ہوں گے تو آپ اور آپ کے ساتھی مستقبل میں اس سے فوائد حاصل کر سکیں گے۔

آپ کے دیئے گئے جوابات آپ کے کسی ساتھی یا خاندان کے کسی بھی فرد کو نہیں دکھائے جائیں گے۔ آپ کی فراہم کردہ معلومات صرف اور صرف تحقیق کرنے والے افراد دیکھ سکیں گے اور یہ معلومات انہی کی زیر نگرانی رکھی جائیں گی۔ آپ کا نام انٹرویو ریکارڈ

میں ظاہر نہیں ہوگا۔ جب بھی کسی کے ساتھ آپ سے حاصل کردہ معلومات کا تبادلہ کیا جائے گا تو ان کو آپ سے منسلک نہیں کیا جاسکے گا۔

اس تحقیق میں شمولیت رضا کارانہ ہے اور آپ کو شمولیت سے انکار کی مکمل آزادی ہے۔حتی کہ آپ شمولیت پر رضامندی کے اظہار کے بعد بھی کسی بھی سوال کا جواب دینے سے انکار کر سکتے ہیں۔جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ اس تحقیق میں آپ سے وقتاً فوقتاً معلومات اکٹھی کی جائیں گی جس کے لئے دو سے تین گھنٹے درکار ہوں گے۔

اگر تحقیق کے دوران آپ کو کسی قسم کی معلومات درکار ہوں تو مندرجہ ذیل نمبر پر رابطہ کریں۔

تحقیق میں شمولیت کا اقرار نامہ:۔

میں نے اجازت نامہ کو پڑھ لیا ہے اور متعلقہ معلومات فراہم کر دی ہیں۔

میں اس تحقیق میں شمولیت اختیار کرتا ہوں یا اور تحقیق کے بعد کے سوالات کے حوالے سے شمولیت پر بھی متفق ہوں۔

جواب دہندہ کے دستخط:۔ ---------- تاریخ:----------

انٹرویو لینے والے کے دستخط:---------- تاریخ:----------

اگر جواب دہندہ ان پڑھ یا پڑھنے لکھنے کے قابل نہیں ہے تو زبانی اجازت حاصل کی گئی:

ہاں---------- نہیں----------

انٹرویو لینے والے کا بیان:۔

قابل فہم زبان میں مسمی ------ نے جواب دہندہ کو اس تحقیق میں شامل ہونے کے فوائد ونقصانات سے آگاہ کر دیا ہے اور جواب دہندہ نے اس تحقیق میں شامل ہونے پر رضامندی کا اظہار کیا ہے۔

انٹرویو لینے والے کے دستخط:---------- تاریخ:----------

ضمیمہ - د

غیر رسمی انٹرویو گائیڈ

1۔جیسا کہ ہماری پہلے بات چیت ہو چکی ہے،تو آپ ہمیں اس واقعے کے بارے میں کچھ بتائیں جس کا آپ نے ذکر کیا تھا؟

2۔آپ نے کیسے مدد کی؟

☆۔جسمانی طور پر

☆۔قانونی طور پر

☆کسی اور طرح (بیان کریں)

3۔کس قسم کی مشکلات،مسائل اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا؟

☆ذاتی رکاوٹیں (دباؤ،بے چینی،گھر سے اجنبیت کا احساس)

☆کمیونٹی کی سطح پر درپیش رکاوٹیں

☆معاشرہ کی سطح پر رکاوٹیں

4۔آپ اپنے مسائل سے خوش اسلوبی سے نبٹنے کے لئے کیا طریقہ کار اختیار کرتے تھے؟(یا کیا)

5 ۔آپ کے اردگرد کے لوگوں کا ردعمل کیا تھا؟شمول خاندان اور کمیونٹی کے افراد کے؟

6۔کیا آپ نے کبھی ان کی طرف سے کسی انتہائی ردِعمل کا سامنا کیا؟

7۔آپ نے اپنی ذاتی رنجیدگی کو کس طرح حل کیا؟

8۔تشدد سے متاثرہ فرد کی مدد کرتے وقت کیا آپ نے کوئی اندرونی دباؤ محسوس کیا؟

9۔عام طور پر کس قسم کی چیزیں آپ کو پریشان کرتی ہیں؟(تھیں)

10۔کسی بھی تشدد سے متاثرہ فرد یا کیس کے حوالے سے مدد فراہم کرتے وقت آپ کے احساسات وجذبات کیا ہوتے ہیں(تھے)؟

11۔وہ کون سے محرکات ہیں جو آپ کو مدد کرتے ہیں یا کسی فرد کی مدد کرنے کا سبب بنتے ہیں؟

12۔اب آپ کی زندگی کیسی گزر رہی ہے؟(ماضی کی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں)

13۔اپنے بچپن کے بارے میں کچھ بتائیں؟ کہاں رہے؟(کوئی یادگار واقعہ یا بات جو اب تک آپ کو یاد ہو)

14۔آپ کا گھریلو نظام کیسا تھا؟(سادہ یا مشترکہ)(فوائد یا نقصانات)

☆کیا مرد،عورتوں،لڑکوں اور لڑکیوں کو تعلیم،نقل وحمل،فیصلہ سازی،اور وسائل تک رسائی کے حوالے سے برابر حقوق اور سہولیات میسر تھیں؟

15۔گھر میں فیصلہ سازی کا اختیار کس کے پاس تھا؟

16۔گھریلو ذمہ داریوں کے بارے میں کچھ بتائیں؟(کیا کیا ذمہ داریاں تھیں آپ پر)(دوسرے بہن،بھائیوں کی کیا ذمہ داریاں تھیں)

17۔والدین کے بارے میں بتائیں؟(والدین کا رویہ،برتاؤ،گھر میں فیصلے کے حوالے سے)

18۔تعلیم حاصل کی آپ نے؟(کتنی،دورانِ تعلیم کوئی ایسا واقعہ جو اب تک یاد ہو،کوئی تجربہ یا بات)

19۔کیا تعلیمی نظام مخلوط تھا یا جداگانہ؟

20۔دوستوں کے متعلق آپ کیسے ہیں؟

21۔کوئی یادگار واقع دوستوں کے حوالے سے (اچھے یا برے)
☆کبھی کوئی برا تجربہ بھی رہا دوستوں کے ساتھ جس میں آپ کو اچھا نہ لگا ہو؟ (کوئی تنازعہ یا لڑائی)
☆کیا آپ نے یا انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف کبھی جسمانی طاقت کا استعمال کیا؟
22۔کیا آپ نے کبھی تشدد ہوتے دیکھا؟
☆اگر ہاں تو کیسا تشدد تھا؟ قسم---
☆کون کس پر کر رہا تھا؟
☆آپ کا فوراً عمل کیا تھا؟
23۔کیا آپ نے دوران بلوغت کبھی اپنے گھر میں تشدد ہوتے دیکھا؟ (کس قسم کا تھا، اور اس پر ردعمل کیا تھا)
24۔کیا آپ نے کبھی خود تشدد کیا اپنے، بہن بھائی، خاندان، دوست یا کمیونٹی کے دوسرے لوگوں پر؟
25۔کچھ اپنے کام کے بارے میں بتائیں؟ (نوکری یا کچھ اور)
☆ساتھی ورکرز کے ساتھ رویہ کیسا تھا؟
☆کیا آپ کے ساتھی ورکرز میں خواتین بھی شامل ہیں؟
☆آپ کو کیا لگتا ہے عورتوں کو گھر سے باہر جا کے کام کرنا چاہیے؟
26۔کوئی ایسا واقعہ جو آپ کو اب تک یاد ہو؟ کام کرتے ہوئے کبھی کسی قسم کی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہو؟

حوالہ جات

1. Aangan, Rozan (2007). The Bitter Truth: An analysis of 200 letters from victims and survivors of child
sexual abuse.
2. Ahmed, S. M. Faizan (2006). Making beautiful: Male workers in beauty parlors. Men and Masculinities,
9(2): 168-185.
3. Ali, T. S., Bustamante-Gavino, I. (2007). Prevalence of and Reasons for Domestic Violence among
Women from Low Socioeconomic Communities of Karachi.
Eastern Mediterranean Journal,
13(6): 1417-1426.
4. Amin, S. (1996).The World of Muslim Women in Colonial Bengal, 1876-1939, Leidan: EJBrill.
Andersson, N., Cockroft, A., Ansari, U., Omer, K., Ansari, N. M., Khan, A., & Chaudhry, U. (2009).
5. Barriers to Disclosing and Reporting Violence Among Women in Pakistan: Findings from a National Household Survey and Focus Group Discussions. J Interpers Violence. Online Publication.
6. Aurat Foundation (2011). Policy and Data Monitor on Violence Against Women.
7. Barker, G. (2000).Gender Equitable Boys in a Gender Inequitable World: Reflections from qualitative
research and program development with young men in Rio de Janeiro, Brazil. Sexual and Relationship Therapy. 15(3): 263-282.
8. Chopra, R. (2006).Invisible Men: Masculinity, sexuality, and male domestic labor. Men and
Masculinities, 9(2): 152-167.
9. Chopra, R., UNIFEM South Asia Regional Office, Zonta International (2007).Reframing Masculinities:
Narrating the supportive practices of men. Orient Longman.
10. Cole, A., & Knowles, G. (2001).Lives in context: The art of life history

research. UK: AltaMira Press.
11. Connell, R. W. (1995). Masculinities. Berkeley: University of California Press.
12. Connell, R. W. (2000). Understanding Men: Gender sociology and the new international research on masculinities. Clark Lecture, Department of Sociology, University of Kansas.
13.Connell, R. W., Messerschmidt, J. W. (2005). Hegemonic masculinity: Rethinking the concept, Gender and Society, 19(6): 829-859.
14. Cornwall, A. (2000). Missing Men? Reflections on men, masculinities and gender in GAD. IDS Bulletin, 31(2): pp. 18-27.
15. Flood, M. (2005). Men's Collective Struggle for Gender Justice. In Handbook of studies on Men and Masculinities. M. S. Kimmel, J. Hearn, R. W. Connell (Eds.). Sage Publications.
16. Greene, M. E. (1997). Watering the Neighbors' Garden: Investing in adolescent girls in India. South and East Asian Regional Working Paper No.7. New Delhi: Population Council.
17. Greig, A. with Edström, J. (2012). Mobilising Men in Practice: Challenging sexual and gender-based violence in institutional settings. Institute of Development Studies. Brighton: IDS.
18. Groes-Green, C. (2009). Hegemonic and Subordinated Masculinities: Class, violence and sexual performance among young Mozambican men. University of Copenhagen, Denmark. Nordic Journal of African Studies, 18(4): 286-304.
19. Hopkins, P. E. (2006). Youthful Muslim Masculinities: Gender and generational relations. Transactions of the Institute of British Geographers, 31(3): 337-352.

20. Humqadam, Rozan (2010). Understanding Masculinities: A formative research on masculinities and gender-based violence in peri-urban areas in Rawalpindi, Pakistan.
21. Jaji, R. (2009). Masculinity on Unstable ground: Young refugee men in Nairobi, Kenya. Department of Social Anthropology, Bayreuth University. Germany: Oxford University Press.
22. Kimmel M. S., Hearn J., Connell R.W. (2005). Handbook of Studies on Men and Masculinities. Sage Publications.
23. Kopf, D. (1969). British Orientalism and the Bengal Renaissance. Calcutta: Firma K. L. Mukhopadhyay.
24. Kumar, R. (1993). The History of Doing: An illustrated account of movements for women's rights and feminism in India, 1800-1990. New Delhi: Kali for Women.
25. Minh-ha, T. T. (1989). Woman, Native, Other: Writing postcoloniality and feminism. Indianapolis: Indiana University Press.
26. Neilsen, L. (2002). Learning from the liminal: Fiction as knowledge. Alberta Journal of Educational Research, 48(3): 206-214.
27. Reilly, J., Muldoon, O. T., Byrne, C. (2004). Young Men as Victims and Perpetrators of Violence in Northern Ireland. Journal of Social Issues, 60(3): 469-484.
28. Richardson, L. (2004). Writing: A method of inquiry. In Approaches to Qualitative Research: A reader on theory and practice. S. N. Hesse-Biber & P. Leavy (Eds.). New York: Oxford University Press.
29. Rogers, S. (2004). What Men Think about Gender Equality: Lessons from OXFAM GB staff in Delhi and

Dhaka. Oxfam GB.

30. Srivastava, S. (2009). Gender: Addressing Unequal Power and Voice

. Technical Background Paper for the

31. UNDP Human Development Report for the Asia-Pacific.
Colombo: UNDP.

32. UNDP (2011). Human Development Report.

33. UNESCAP (2007). Violence against women: Harmful traditional and cultural practices in the Asian and
Pacific regions.